دریا کا گھر
نجم الحسن رضوی

دریا کا گھر | نجم الحسن رضوی

دریا کا گھر

نجم الحسن رضوی

اکادمی بازیافت

دریائے مہران کے نام ور سپوت

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے نام

ایک جید ماہرِ تعلیم، محقق، تاریخ داں، لغت ساز، کلامِ بھٹائی کے نباض اور سندھی شاعری، موسیقی اور لوک ادب کے غواص کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زندگی میں حیرت ناک تخلیقی زرخیزی کا مظاہرہ کیا اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لیے ڈیڑھ سو سے زائد تصنیفات چھوڑ کے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد کراچی آرٹس کونسل میں ہونے والے ایک تعزیتی جلسے میں دریائے سندھ کے بارے میں ان کی ریکارڈ کی ہوئی ایک تقریر جب میں نے سنی تو پتا چلا کہ دریا بھی بولتے ہیں۔

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

میر تقی میرؔ

فہرست

دریا آخر دریا ہے (پیش لفظ)	۹
دریا کا گھر	۱۳
مژگاں تو کھول...	۲۳
روٹی اور سانپ	۳۱
امدادی کیمپ	۳۸
زندہ بستی	۴۸
اللہ وسایا واٹر ورکس	۵۵
شہر نامہ	۶۳
سخی لوگ	۷۱
ڈیزائنر بے بی	۷۹
نامعلوم شخص	۸۷

اداکار	۹۶
آدمی اور جانور	۱۰۳
رِپ وان ونکل کی ڈائری	۱۱۲
ایک مصرع میرؔ کا	۱۱۹
خوابوں کے گھر	۱۲۷
گھ — روندے	۱۳۵
کان نہیں بولتے	۱۴۵
شب چراغ	۱۵۱
پری گل	۱۵۹
رشتے ناتے	۱۶۶

دریا آخر دریا ہے

دریا سے میری وابستگی پرانی ہے۔ سکھر میں اس کی حیات افروز صدائیں بچپن
سے کانوں میں ذخیرہ ہوتی رہیں اور دریا سائیں سے میں نے جینے کا قرینہ سیکھا۔ اپنے
افسانوں کے دوسرے مجموعے ''ہاتھ بیچنے والے'' کے ابتدائیے میں، میں نے اس خواہش کا
اظہار کیا تھا کہ ''لکھنے والے کو دریا صفت ہونا چاہیے، زندگی کے قدم سے قدم ملا کے چلنے
والا، دھن کا پکا اور دوسروں کے کشتِ علم کو سیراب کرنے والا۔'' اس بات کو بہت سال
ہوگئے اور میں اس دوران کئی سمندروں کو پھلانگ کے گھر لوٹ آیا ہوں مگر دریا سائیں نے
ہمیشہ میرا ہاتھ تھامے رکھا اور آج بھی اس کی پکار مجھے بالکل قریب سے سنائی دیتی ہے۔
شاید اس کی وجہ وہی ہے جو ٹی ایس ایلیٹ نے بیان کی ہے کہ دریا تو ہمارے اندر ہے۔
کہیں یہ خود زندگی تو نہیں، جیتے رہنے کی خواہش اور وقت کو اپنی مٹھی میں بند کرلینے کی
آرزو۔ ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب— مگر میرے لیے تو شاید یہی افسانہ ہے کبھی ختم
نہ ہونے والا! دریا مجھے اسی لیے عزیز ہے کہ یہ زندگی کی ہمہ گیریت کا عکس ہے— بہتے
وقت کا دھارا جس میں گزری تہذیبوں کے نقوش، غرقاب زمانوں کی آوازیں اور نئی
بستیوں کے خواب دل کش جزیروں کی شکل میں ابھرتے ہیں اور افسانے کے نئے
موضوعات جنم لیتے ہیں۔

ویسے افسانہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ افسانے اور کہانی میں اگر کوئی فرق ہے تو

وہ کیا ہے اور افسانے کیسے لکھے جائیں کہ ان میں لارنس ہی کے الفاظ میں ''ایک بصیرت، ایک عقیدے اور ایک مابعدالطبیعیات'' کا کھوج لگایا جاسکے یا پھر ان کی ساختیاتی اور اسلوبیاتی نیرنگیوں اور ان کی دیومالائی جہتوں اور علامتی پرتوں کی داد دی جائے۔ مجھے ان بحثوں سے کبھی کوئی خاص دل چسپی نہیں رہی، اس لیے جولوگ ایسی باتوں میں سر کھپاتے ہیں، میں ان کے پاس کم کم ہی پھٹکتا ہوں۔ لارنس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''فن کار کا کبھی اعتبار مت کیجیے، کہانی کا اعتبار کیجیے۔'' مجھے یہاں 'فن کار' کی جگہ 'نقاد' کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت دیجیے کیوں کہ اچھی کہانی وہی ہوتی ہے جس کی اثرانگیزی کہانی کار کی شہرت یا کسی چرب زبان اور جادوقلم نقاد کی تنقیدی موشگافیوں کی مرہونِ منت نہ ہو۔

میں کہانی میں تازگی کا دل دادہ ہوں۔ اس کے لیے اسلوبیاتی دل کشی بھی اہم ہے مگر اس معاملے میں مجھے ہمیشہ موضوعاتی تنوع نے ضروری کمک فراہم کی ہے۔

''چشمِ تماشا'' کے بعد جو ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا، ''ہاتھ بیچنے والے''، ''پُر سے کا موسم''، ''انٹرنیٹ کیفے'' اور ''آکسیجن'' کے ناموں سے میرے افسانوں کے جو مجموعے ۲۰۰۸ء تک چھپے، ان کی ساری کہانیاں وطن سے دور رہتے ہوئے لکھی گئی تھیں اور پڑھنے والوں کو ان سے یہ اندازہ ضرور ہوا ہوگا کہ لکھنے والے کی آنکھ اگر سفر کے دوران جاگتی رہے تو اس کے اپنے فائدے ہیں۔

میں نے متحدہ عرب امارات میں اپنے طویل قیام کے دوران تارکینِ وطن کے معاملات کے حوالے سے جو کہانیاں لکھیں اور عرب معاشرے میں روایتی قدروں کے انہدام کی جو تصویریں پیش کیں، ان سے مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی۔ کیوں کہ ان میں کچھ نئے منظر ابھر کے سامنے آئے تھے۔ ''تماش گاہ'' نامی کہانی کے بارے میں جو اونٹوں کی دوڑ کے موضوع پر لکھی گئی تھی، مدیرِ ''اوراق'' ڈاکٹر وزیر آغا نے مجھے اپنے خط میں لکھا، ''افسانے کا موضوع ایسا ہے جو اردو فکشن میں اس سے قبل سامنے نہیں لایا گیا تھا مگر محض موضوع کا نیا پن ہی نہیں، آپ کی ٹریٹمنٹ بھی قابلِ تعریف ہے۔'' اسی طرح دیگر ملکوں کے سفر کے دوران بھی مجھے بہت سی ایسی انوکھی کہانیاں میسر آئیں جن کا تصور یہاں بیٹھ

کے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مثال کے طور پر ''غسلِ آفتابی'' میں مصروف دوشیزاؤں کے بارے میں ''سوہنی اور ساحل'' نامی کہانی جو ''ہاتھ بیچنے والے'' میں شامل ہے، قبرص کے سفر کے بعد لکھی گئی تھی اور ''پارسائی کی رات'' ملائیشیا کے مشرقی ساحل پر واقع ایک سیاحتی مرکز میں موجود میں آئی۔ اسی طرح ''انوکھے تحفے'' نامی کہانی جس پر بعد میں ہندوستان میں پینگوئن کے تحت چھپنے والی کہانیوں کی ایک کتاب کے مرتبین کی نگاہِ انتخاب پڑی، سنگاپور کے ایک بازار سے گزرتے ہوئے ہاتھ آئی اور بنکاک میں بدھسٹ عبادت گاہوں کی سیر کے دوران تکمیل کو پہنچی۔ اسی طرح ''سفاری'' کی جائے پیدائش کینیا کے جنگلوں میں موجود وہ شکارگاہ ہے جہاں دی آرک یعنی کشتیِ نوح کے نام سے سیاحوں کے لیے ایک پناہ گاہ تعمیر کی گئی ہے۔ اس پناہ گاہ کے چاروں طرف رات بھر جنگلی بھینسے، ہاتھی اور شیر چنگھاڑتے اور ڈکراتے پھرتے ہیں۔ آخر الذکر دونوں کہانیاں میرے مجموعے ''آکسیجن'' میں شائع ہوئی ہیں۔ اسی طرح امریکا کے سفر کے بعد ''ہیلووین'' یعنی بھوتوں کی شام کے حوالے سے جو کہانی میں نے ''ڈیزائنر بے بی'' کے نام سے لکھی ہے، وہ تازہ مجموعے میں شامل ہے۔

بعض لوگوں کو ان کہانیوں پر ترجمے کا گمان ہوا جس کی وجہ میرے خیال میں صرف یہ ہے کہ ان افسانوں کے موضوعات غیرروایتی تھے اور فضا نامانوس، لیکن ان افسانوں کی علامتی تہ داری اور نکتہ آفرینی کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں اسی جذبے کے تحت پڑھا جانا چاہیے جس کے تحت اختراعی کاوشیں قابلِ توجہ ٹھہرتی ہیں۔ ان کہانیوں کا مقصد سفرناموں کی طرح قارئین کو محض چند انوکھے مناظر دکھا کے خوش کرنا یا چونکانا نہیں بلکہ ان کے ذریعے انسانی فطرت کے نہاں خانوں میں سوچ کے نئے روشن دانوں کا سراغ لگانا ہے۔

میری رائے میں عالمی سطح پر مختلف معاشروں کے مشاہدے اور قدیم روایتوں کے تقابلی مطالعے کو انسان شناسی کے عمل کا حصہ سمجھنا چاہیے جس کے نتیجے میں افسانے کا دامن وسیع تر ہو سکے گا۔ یہ کام برطانیہ، امریکا، کینیڈا اور دیگر ممالک میں لکھے جانے والے اردو فکشن میں برابر ہو رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس عمل میں تھوڑا بہت میرا بھی حصہ ہے۔

''دریا کا گھر'' میرے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ہے اور اس کی زیادہ تر کہانیاں جو

دو سال قبل میرے وطن واپس آنے کے بعد وجود میں آئی ہیں اُن دکھوں سے عبارت ہیں جو سیلاب سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا نتیجہ تھے، ایسا سیلاب جو دریا کے بپھرنے سے وجود میں آیا اور ایسا سیلاب بھی جو تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے زوال کے سبب معاشرے کی صورت بگاڑ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان افسانوں کو پڑھ کے آپ یہ ضرور جان سکیں گے کہ اگرچہ میں لوٹ آیا ہوں مگر میری آنکھ مستقل سفر میں رہتی ہے۔

نجم الحسن رضوی

کراچی، یکم جون ۲۰۱۱ء

دریا کا گھر

حیرت کی بات تھی کہ بپھرے سیلابی ریلے نے جنوں کی مسجد کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساری کی ساری دریا کے گدلے پانی میں ڈوب گئی تھی اور اب دور سے بس اس کا ایک مینار نظر آ رہا تھا جہاں کھڑے ہو کے ادا ہاشم اذان دیتا تھا۔ اسے کچی مسجد بھی کہا جاتا تھا کیوں کہ وہ کچی اینٹوں سے بنی تھی مگر پہلے کبھی تیز آندھی یا طوفانی بارش میں بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ جنات اس کے محافظ ہیں۔

سب کو یقین تھا، مسجد کے جن اسے ڈوبنے نہیں دیں گے مگر اس کا جو حشر ہوا تھا، اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کے کہیں اور چلے گئے تھے۔ بابا نے بتایا تھا کہ جنات آگ سے بنے ہوتے ہیں، شاید اسی وجہ سے وہ پانی سے بھاگتے ہوں گے۔ سچل نے سوچا۔

سہ پہر کے وقت دریا نے پرانے شہر کی فصیل سے اپنی کمر رگڑتے ہوئے اتنے زور سے پھنکار ماری کہ حفاظتی بند کے پرخچے اُڑ گئے اور پانی آس پاس کے علاقوں میں گھروں، کھیتوں اور کھلیانوں کو روندتا چلا گیا۔ سیلابی ریلا اتنا تیز تھا کہ اس نے چند گھنٹوں میں پرانے شہر اور آس پاس کے سب دیہاتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

جس وقت پانی بستی میں داخل ہوا، مرکزی چوک میں 'بند ٹوٹ گیا' کے شور کے ساتھ بھگدڑ مچ گئی۔ مرد اور عورت، بوڑھے اور جوان جو اس وقت وہاں موجود تھے، سر پر پاؤں رکھ کے اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔ دوڑتے ہوئے سچل کی ایک چپل اس کے پاؤں سے نکل گئی مگر اس نے پروا نہیں کی اور دوسری چپل سے بھی اپنی جان چھڑا کے گھر کی طرف اور تیزی سے دوڑ لگائی۔

پھر جب وہ اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا، محلے کی چھوٹی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جا رہا تھا کہ بستی کے لوگ جلد سے جلد محفوظ مقامات پر چلے جائیں۔ سچل نے دیکھا، سب لوگ گھروں سے باہر نکل رہے تھے اور انھوں نے سارا ضروری سامان اپنے سروں پر اٹھا رکھا تھا۔ چارپائیاں، پانی کی گاگریں، کھانے کے برتن، جست کے صندوق اور کپڑوں کی گٹھڑیاں — بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو ہنکاتے لیے جا رہے تھے۔ سچل نے جلدی سے صحن میں کھڑی سائیکل اٹھائی اور لوگوں کے ساتھ ساتھ چل کھڑا ہوا۔ اچانک ایک خرگوش پھدک کے اس کے سامنے آ گیا۔ اس نے خرگوش کو ایک ٹوکری میں بند کر کے سائیکل کے کیریئر میں اٹکا لیا اور جلدی جلدی پیڈل مارنے لگا۔ اس کے گھر والے شاید پہلے ہی قافلے میں شامل ہو چکے تھے۔

دریا کے بند میں شگاف سہ پہر میں پڑا تھا اور شام ہوتے ہوتے پوری بستی خالی ہو گئی۔ دریا راستے میں آنے والی ہر شے کو غڑپ غڑپ پی گیا۔ کتنا پیاسا تھا دریا — سچل نے سوچا۔

ریلوے لائن کے پشتے پر سیلاب سے پناہ لینے والے سیکڑوں افراد جمع تھے، ان میں دور اور نزدیک سے آنے والے سارے لوگ شامل تھے۔ سچل کو اپنے گھر والوں کو زیادہ ڈھونڈنا نہیں پڑا۔ وہ اسے ایک طرف بیٹھے ہوئے مل گئے۔ انھوں نے فرش پر ایک دری بچھا رکھی تھی جسے وہ بچا کے لے آئے تھے اور اسی پر ان کی ساری کائنات ڈھیر تھی — پانی کی صراحی، کچھ برتن اور کپڑوں کی پوٹلی۔

سچل کی اماں کو اپنے مویشیوں کی فکر تھی، خاص طور پر اپنی پیاری بھینس کی، جسے

وہ اپنے سر پر بھی لاد کے لے آتی مگر وہ اس وقت وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ جنگل میں گھاس چرنے گئی ہوئی تھی۔

سچل نے سائیکل کے کیریئر سے ٹوکری اٹھائی اور اس میں بند خرگوش اماں کو دکھایا مگر وہ اسے دیکھ کے بالکل خوش نہیں ہوئی۔ سچل نے ٹوکری کا ڈھکنا کھولا تو خرگوش جست لگا کے ایک طرف بھاگ گیا۔ اماں اپنی بھینس کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی۔ بابا کو بھی چپ لگ گئی تھی، کیوں کہ دریا کچے پر واقع اس کے سارے کھیت ہڑپ کر گیا تھا۔

اچانک اماں کی گود میں بیٹھی سچل کی چھوٹی بہن نوری زور زور سے رونے لگی۔ اسے سخت گرمی لگ رہی تھی۔ اماں نے غصے میں اسے ایک دوہتڑ رسید کیا اور دور ڈھکیل دیا۔ سچل وہاں سے ہٹ گیا۔ اماں غصے سے پھنکار رہی تھی اور اس وقت اس کے پاس ٹھہرنا مصیبت کو دعوت دینا تھا۔

سچل ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور تک ٹہلتا چلا گیا۔ اس کے پشتے پر دونوں طرف پناہ گزینوں نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ لوگ سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ عورتیں، مرد اور بچے — اسے ان میں اپنا کوئی جاننے والا نظر نہ آیا۔ اس نے سوچا اگر اس وقت اس کا دوست پریل مل جاتا تو کتنا مزہ آتا۔ وہ دونوں ساتھ مل کے اِدھر اُدھر گھومتے اور پانی میں ڈوبے شہر کی خبر لاتے۔

ریلوے لائن کے نیچے پرانے شہر کے گلی کوچوں میں پانی کی بل کھاتی لہریں اتنی اونچی ہوچکی تھیں کہ بہت سے لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پر پناہ لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔ ریلوے لائن کے کنارے سیلاب زدہ بستیوں سے جان بچا کے آنے والے غم زدہ خاندانوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ ہر طرح وہاں پہنچ رہے تھے۔ پانی میں بہتے ہوئے، اپنے مویشیوں کی گردنوں سے لٹکتے ہوئے، لکڑی کے تختوں، جڑ سے اکھڑے درختوں، چارپائیوں اور پرانے ٹائروں کو جوڑ کے ہنگامی سفر کے لیے بنائے جانے والے عارضی سفینوں میں —

پھر اچانک بارش شروع ہوگئی اور ہر طرف کہرام سا مچ گیا۔ لوگ بارش سے بچاؤ

کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ کچھ نے چارپائیاں ترچھی کھڑی کردیں اور ان کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ ماں نے فرش پر بچھی دری اٹھا کے اپنے اور بابا کے سروں پر تان لی جس سے وہاں چھوٹا سا چھجا بن گیا۔ سچل بھی اس کے نیچے گھس گیا مگر وہ کچھ ہی دیر میں اکتا گیا۔ بارش باہر بھی تھی اور اندر بھی— اماں رو رہی تھی۔ وہ مسلسل اپنی بھینس کے لیے بَین کر رہی تھی۔ بابا نے کہا بھی، فکر مت کر نیک بخت! بھینس تجھے ضرور ملے گی، ادا ہاشم اس کے ساتھ ہے نا— ادا ہاشم گایوں اور بھینسوں کو جنگل میں لے گیا تھا، روز کی طرح، انھیں چرانے۔

ادا ہاشم کی شکل سچل کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی— لمبا چوڑا— خود بھی وہ کوئی جن ہی لگتا تھا— بڑے بڑے ہاتھ اور یہ بڑا سا منہ!

''بابا!''، اس نے پوچھا، ''ادا ہاشم کو جنوں سے ڈر نہیں لگتا؟''

''ڈر؟'' بابا نے کہا، ''ادا ہاشم اور ڈر— اسے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ وہ جنوں کی مسجد میں اذان دیتا ہے اور راتوں میں جنوں کی بگھی بھی چلاتا ہے جو تہجد پڑھنے آتے ہیں!''

''جنوں کی بگھی—!'' سچل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں—'' بابا نے کہا، ''بہت سے لوگوں نے دیکھی ہے وہ عجیب و غریب بگھی— اس میں گھوڑوں کی جگہ بھینسیں جتی ہوئی ہوتی ہیں مگر جب وہ دوڑتی ہیں تو آسمان پر بادل گرجتے ہیں۔''

''مگر ادا ہاشم رہتا کہاں ہے بابا؟'' سچل نے پھر سوال کیا۔

''جنوں کی مسجد میں اور کہاں—'' بابا نے جواب دیا، ''بھینسوں کے جنگل سے واپس آنے کے بعد وہ اپنے حجرے میں چلا جاتا ہے۔''

سچل نے باہر جھانکا۔ بارش ختم گئی تھی مگر گھپ اندھیرے میں لوگوں کا کہرام بپا تھا۔ بچے رو رہے تھے اور بہت سے مرد اور عورتیں اپنے بچھڑے ہوئے گھر کے افراد کو پکار رہے تھے۔

رات اسی طرح گزر گئی مگر صبح ہوتے ہی ریلوے لائن جاگ اٹھی اور ایک طرف سے ایک کالا انجن نمودار ہوا جس کے ساتھ چار پانچ ڈبے بھی تھے۔ انجن تیز تیز سیٹیاں بجاتا آیا تاکہ لوگ ریلوے لائن سے دور ہو جائیں۔ یہ امدادی گاڑی کسی قریبی اسٹیشن سے بھیجی گئی تھی۔ انجن بھاپ چھوڑتا ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اس کے ڈبوں میں امدادی سامان تھا اور فوجی دستے — فوجیوں نے مستعدی سے نیچے اتر کے ریلوے لائن کے اطراف میں موجود پناہ گزینوں کا جائزہ لیا، پھر لوگوں کو قطار لگا کے امدادی سامان وصول کرنے کی ہدایت کی۔

رات کی بارش کے بعد آسمان بڑا دُھلا دُھلا اور شفاف لگ رہا تھا مگر نیچے ہر طرف پانی اور کیچڑ کا راج تھا۔ امدادی ٹرین پہنچنے کے کچھ ہی دیر کے بعد ریلوے لائن کی دوسری سمت ذرا اونچائی پر جہاں سیلابی پانی نہیں پہنچ پایا تھا، ایک خیمہ بستی وجود میں آ گئی۔ لوگ امدادی سامان لے کر اپنے اپنے خیموں میں جا رہے تھے۔ کچھ لوگ ابھی ریلوے لائن کے پشتے پر بیٹھے تھے اور امدادی پیکٹوں میں آنے والے ناشتے پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ سچل نے دیکھا بابا خود بھی امدادی سامان لینے والوں کی لائن میں کھڑا تھا۔ مگر ماں کو ان باتوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ ابھی تک آنسو بہائے جا رہی تھی۔ اتنی پیاری تھی اسے اپنی بھینس۔ سچل نے دیکھا، ماں بہت کم زور لگ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے لپٹ کے ایک بار پھر اسے تسلیاں دے اور اپنی چھوٹی بہن نوری کو گود میں اٹھا کے باہر لے جائے مگر اسی وقت کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا اس کا دوست پریل سامنے کھڑا تھا، وہ اس کے گلے لگ گیا۔ ’’شکر ہے اللہ سائیں کا‘‘، سچل بولا، ’’میں تو سمجھا تھا کہ...!‘‘ ’’نہیں، میں بچ گیا۔‘‘ پریل نے کہا، ’’سب گھر والے بھی خیریت سے آ گئے، بس چاچا ابھی تک نہیں آیا — رہے ڈھور ڈنگر، تو وہ سب گئے — بکریاں اور مرغیاں بھی۔‘‘

’’مجھے پتا ہے۔‘‘ سچل نے دکھ سے کہا، ’’اماں بھی اپنی بھینس کے لیے رو رو کے آنکھیں پھوڑ رہی ہے۔‘‘

پریل نے پلاسٹک کی تھیلی میں سے دو پاپے نکالے اور ایک سچل کو دیا، ''کھاؤ— میری تو بھوک سے بری حالت ہے رات سے۔ اب جا کے کچھ کھانے کو ملا ہے۔'' بابا بھی امدادی سامان میں سے اپنا حصہ لے کر واپس آگیا تھا۔ اس نے دونوں لڑکوں کو پینے کے لیے لسّی کے دو ڈبے دیے۔

سچل اور پریل ٹہلتے ہوئے اس طرف چلے گئے جہاں فوجی جوان امدادی کاموں میں مصروف تھے۔ انھوں نے فوجیوں کو چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں ڈوبے ہوئے شہر میں پھنسے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے جاتے دیکھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد متاثرین کے نئے گروہ کشتیوں میں امدادی کیمپ میں لائے جا رہے تھے۔ اب آسمان پر ہیلی کوپٹر بھی چکر لگانے لگے تھے۔ دونوں دوست ریلوے لائن کے پشتے پر بیٹھے ہیلی کوپٹروں کو ڈوبے شہر پر اُڑتے دیکھتے رہے۔ ہیلی کوپٹروں سے کشتیوں میں موجود امدادی ٹیموں کو مکانوں کی چھتوں پر پھنسے ہوئے لوگوں کے بارے میں ہدایات دی جا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی ہیلی کوپٹر خود ہی نیچی پرواز کر کے کسی ڈوبے ہوئے مکان کی چھت پر پھنسے ہوئے کسی شخص کو باہر نکالنے کے لیے رسّی کی سیڑھی نیچے لٹکا دیتا۔

پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا اور اس میں طرح طرح کی چیزیں تیر رہی تھیں۔ گھروں کی چھتوں کے شہتیر، ٹوٹے چھپر، جھلنگا چارپائیاں—

ایک فوجی نے کہا، ''اب تک دریا کا غصہ کم نہیں ہوا۔''

دوسرے نے جواب دیا، ''دریا تو ہوتا ہی ایسا ہے، غصیلا، ضدی اور اپنی مرضی کا مالک۔''

ایک بار لڑکوں نے دیکھا کہ فوجی جوان پانی میں سے کوئی چیز باہر نکال رہے ہیں۔ پتا چلا کہ وہ کسی نوجوان کی نعش تھی جو کہیں دور سے بہتی ہوئی آ رہی تھی۔ سیلابی ریلے میں بہت سے مرے ہوئے جانور بھی بہتے نظر آئے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں ایک گائے بھی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ زندہ تھی اور بڑی بہادری سے پانی کے چکراتے دائروں کو کاٹ کر آگے بڑھ رہی تھی مگر اماں کی بھینس کا کہیں پتا نہ تھا۔ سچل نے سوچا،

''بے چاری اماں—!''

وہ ایک بار پھر اماں کی طرف گیا۔ بابا نے اب اماں کو ایک خیمے میں بٹھا دیا تھا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی اس کے پاس دھری تھیں مگر اماں...

سچل نے بابا کو ایک نظر دیکھا جو چٹائی پر کمر سیدھی کرنے لیٹ گیا تھا۔

''بابا—'' اس نے کہا، ''ابھی ابھی ایک گائے کو باہر نکالا گیا ہے— زندہ ہے وہ—''

''ہاں، ہاں تو آئے گی نا تیری اماں کی بھینس بھی—'' بابا نے کہا، ''ادا ہاشم ساتھ ہے اس کے—''

''ادا ہاشم—'' سچل چونکا، پھر اس نے کچھ سوچ کے پوچھا، ''بابا کیا پتا وہ... کہیں ادا ہاشم جنوں کے ساتھ ہی بھینسوں والی بگھی میں تو... آخر جنوں کو بھی تو کہیں جانا ہوگا۔ ان کی تو مسجد ہی ڈوب گئی۔''

''نہیں، نہیں...'' بابا نے جواب دیا، ''وہ کہیں نہیں ہمیں چھوڑ کے... تیری اماں کو— وہ تیری اماں کی بھینس بھی ضرور واپس لائے گا!''

''کیوں بابا؟'' سچل نے پھر سوال کیا۔

''اس لیے کہ ادا ہاشم تیرا ماما ہے نا—'' تیری اماں کا سگا بھائی۔

''کیا؟'' سچل کو حیرت کی ایک اونچی لہر ساتھ بہا لے گئی۔ ''پھر ماما ہمارے گھر میں کیوں نہیں رہتا بابا؟'' وہ منمنایا۔

''اس لیے کہ تمھاری اماں نے ایک بار بہت پہلے اسے ناکارہ کہہ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ کھیتوں پر کام نہیں کرتا تھا اور دن بھر آوارہ لڑکوں کے ساتھ مار پیٹ کرتا پھرتا تھا۔ ایک مرتبہ اسے چوری کے شبہے میں پولیس پکڑ کے لے گئی تھی، اگرچہ اس بات پر کبھی کسی کو یقین نہیں آیا، کیوں کہ ادا ہاشم کو چوری اور چوروں سے نفرت تھی اور صرف اسی وجہ سے اسے کئی سال جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی تھی۔''

''وہ کیسے بابا؟'' سچل نے پوچھا۔

''ادا ہاشم نے وڈیرے اللہ وسایا کے ایک خاص کارندے کو جو پڑوسی کے گوٹھ

سے گائیں اور بھینسیں چرا کے لے جا رہا تھا، ایک بار راستے میں روک لیا تھا اور اسے گوٹھ والوں کے مویشی چرانے سے منع کیا تھا مگر جب وہ جھگڑا کرنے لگا تو ادا ہاشم نے اسے صرف ایک گھونسا مارا مگر وہ کم بخت تو مر ہی گیا۔ پولیس ادا ہاشم کو پکڑ کے لے گئی اور پھر کئی سال بعد جیل سے اس کی جان چھوٹی۔''

''مگر پھر وہ گھر واپس کیوں نہیں آیا؟'' سچل حیران تھا۔

''اس لیے کہ وہ تیری اماں سے ڈرتا تھا، وہ واپس آنے کو تیار ہی نہیں ہوا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ کچی مسجد میں خوش تھا اور اسے وہاں جنوں نے پناہ دی تھی کیوں کہ وڈیرے اللہ وسایا کے آدمی اب بھی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جنوں کی مسجد میں کوئی نہیں جاتا تھا ڈر کے مارے — یہ تو بس ادا ہاشم کا دل گردہ تھا جو ان کی خدمت کرتا تھا۔'' بابا چپ ہوگیا۔

اسی وقت پریل نے اس کے خیمے میں جھانک کے سچل کو پکارا — ''چلو ذرا دیکھتے ہیں فوجی امدادی کشتی میں اور بہت سا امدادی سامان لائے ہیں۔'' وہ دونوں لپک کے باہر گئے۔ فوجی جوان ایک بڑی سی موٹر بوٹ سے امدادی اشیا اتار رہے تھے — کمبل، برساتیاں، خشک دودھ کے ڈبے اور بسکٹوں کے پیکٹ۔ لوگوں میں کمبل بانٹنے کا سلسلہ شروع ہوا تو پریل اور سچل نے بھی ایک ایک کمبل اٹھا لیا۔

سچل نے ایک فوجی سے پوچھا، ''آپ میرے ماما کو لا سکتے ہیں؟''

''کہاں ہیں تمھارے ماما؟'' فوجی نے سوال کیا۔

''وہاں جنگل میں۔'' سچل نے ڈوبے ہوئے شہر کے پیچھے دریا کے کچے علاقے میں درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں پانی ہی پانی تھا، طوفانی مٹیالا پانی — ''وہ بھینسیں چرانے گئے تھے۔''

''ہمارے دوسرے ساتھی اُدھر ہی سے آ رہے ہیں — '' فوجی نے بتایا اور قریب کھڑی ہوئی کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ پانی میں ڈولتی کشتی سے کئی مرد اور عورتیں ڈگمگاتے ہوئے اترے۔ سچل اور پریل کشتی کے پاس گئے۔ ایک فوجی افسر اپنے ساتھی سے بات کر

رہا تھا، ''بہت پانی ہے یار— ہم نے بہت سارے ایسے لوگوں کو بچایا جو اپنے گھروں کی چھتوں یا ڈوبے ہوئے پیڑوں کی ڈالیوں پر پھنسے ہوئے امداد کے انتظار میں تھے۔ دریا ہر طرف پھیل گیا ہے۔''

ایک بوڑھا کسان پاس کھڑا تھا، وہ بولا، ''دریا سائیں ایک بار اپنے گھر سے نکل جائے تو واپس نہیں لوٹتا، پھر سب گھر اس کے ہوتے ہیں۔''

اتنے میں ایک آدمی ایک کشتی سے اترا— گیلا کُرتہ اور کیچڑ میں اٹی شلوار پہنے— پریل اسے دیکھتے ہی خوشی سے چلّایا، ''چاچا— چاچا!''

چاچا پریل کو دیکھ کے خوش ہوا— ''اچھا تم لوگ بھی اِدھر ہو، شکر ہے!'' پھر اس نے سچل کو دیکھا اور بولا، ''تیرا بابا اور اماں تو ٹھیک ہے نا، مگر ادا ہاشم؟''

سچل نے کہا، ''وہ تو نہیں آیا ابھی تک۔''

پریل کے چاچا نے کہا، ''کیسے آئے گا وہ— میں نے اسے دیکھا تھا بھینسوں کے ساتھ پانی میں— بہت گہرا پانی تھا— مگر وہ پاگل خانہ! اس کا سارا بدن پانی میں چھپا ہوا تھا، بس بڑا سا منہ باہر نکلا ہوا تھا جیسے وہ اس کا نہیں دریا کا سر ہو۔''

کشتی کے قریب کھڑے ہوئے فوجی نے اس کی بات سن لی، ''اچھا— وہ عجیب بندہ تھا بھئی، اس نے مجھے حیران کردیا۔ میں نے اس سے کشتی پر سوار ہونے کو کہا مگر وہ بولا، پہلے میری بھینسیں— میں نے لاکھ کہا مگر وہ بضد رہا اور بھینسوں کے بغیر کشتی میں سوار ہونے کو تیار نہیں ہوا۔'' پریل کا چاچا بولا، ''وہ ہمیشہ سے ایسا ہے، غصیلا، ضدی اور اپنی مرضی کا مالک— ادا ہاشم! اللہ سائیں اس کی مدد کرے، بہت تیز پانی ہے۔''

فوجی نے کہا، ''دریا کے غصے سے اللہ بچائے!''

سچل نے اپنا کمبل بھی پریل کے حوالے کردیا۔ پھر وہ دوڑ کے اپنے خیمے کی طرف گیا۔ ''کچھ اور کشتیاں لوگوں کو لائی ہیں بابا!'' اس نے خیمے میں داخل ہو کے زور سے اعلان کیا، ''مگر ادا ہاشم ان میں نہیں ہے۔''

''آئے گا— آجائے گا—'' بابا نے بس اتنا کہا اور پھر اس کی چھوٹی بہن

نوری کو کندھے پر لادے باہر جانے لگا۔ سچل نے اماں کو دیکھا جو ایک کونے میں بیٹھی رو رہی تھی۔

سچل نے کہا، ''بابا! اماں اب تک رو رہی ہے، اپنی بھینس کے لیے!''

بابا نے باہر نکلتے ہوئے جواب دیا، ''رونے دے اسے، بھینس اکیلی تھوڑا ہی ہے۔''

سچل ایک طرف چٹائی پر لڑھک گیا اور ذرا دیر میں گہری نیند سو گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ادا ہاشم دریا کے سینے پر بھینسوں کی بگھی دوڑاتا چلا آ رہا ہے اور پہاڑ جیسی اونچی اونچی لہریں احتراماً پیچھے ہٹ کے اسے راستہ دے رہی ہیں۔

مژگاں تو کھول...

ملزم عدالت میں حاضر تھا اور متعدد گواہیاں اس کے خلاف پیش کی جا چکی تھیں۔
اس پر الزام تھا کہ وہ سیلاب سے گھری ایک بستی میں لوگوں کو ڈوبتا چھوڑ آیا تھا۔ ملزم محمد بخش ایک فلاحی تنظیم کی اس امدادی ٹیم کا رکن تھا جو سیلاب زدہ علاقوں سے متاثرین کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کا کام کر رہی تھی۔ وہ ہر روز صبح سے شام تک اپنی کشتی میں دریا کی بپھرتی موجوں سے پنجہ آزمائی کرتا، دور دور تک مصیبت زدہ لوگوں کی تلاش جاری رکھتا، پھر جب لوٹتا تو اس کی کشتی پناہ گزینوں سے بھری ہوتی مگر اب اس کے سر پر قانون کی تلوار لٹک رہی تھی۔

پولیس کی ابتدائی تفتیش کے بعد اس کا کیس عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔
استغاثہ کا بیان تھا کہ محمد بخش نے سیلاب زدہ افراد کو اپنی کشتی میں سوار ہونے کا موقع نہ دے کر اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کا مظاہرہ کیا تھا جس کی اسے بھرپور سزا ملنی چاہیے کیوں کہ صرف اس کی غفلت کی وجہ سے بہت سارے لوگوں کی جانیں خطرے میں پڑ گئی تھیں۔

اپنے دعوے کے ثبوت میں استغاثہ نے کئی گواہ بھی عدالت میں پیش کیے تھے۔
ایک گواہ نے اپنا بیان دیتے ہوئے جائے وقوعہ کا بہت بھیانک نقشہ کھینچا تھا۔ اس کا کہنا تھا

کہ دریا نے پوری بستی کو نگل لیا تھا اور ہر طرف پانی کے پہاڑ کھڑے تھے۔ لوگ مکانوں کی چھتوں پر پھنسے ہوئے کسی غیبی مدد کے انتظار میں تھے کہ امدادی کشتی نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے اور کشتی میں سوار ہونا چاہا مگر ملزم محمد بخش نے انھیں اپنی کشتی میں سوار نہیں ہونے دیا اور ان کے چیخنے چلّانے کے باوجود انھیں پانی میں ڈوبتا چھوڑ کے چلا گیا۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اس الزام کو دُہرایا تھا۔

وکیلِ صفائی نے عدالت کو بتایا کہ گواہوں کے بیانات میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا اور اس کے مؤکل کے خلاف بہت سی بے بنیاد باتیں کہی گئی تھیں۔ وکیلِ صفائی نے گواہوں کے اس بیان کی تردید کی کہ امدادی کشتی پر سیلاب زدگان کو سوار نہیں ہونے دیا گیا۔ انھوں نے عدالت سے درخواست کی کہ ان کے مؤکل کو ایک بار عدالت کے سامنے پورا واقعہ دُہرانے کا موقع دیا جائے۔

استغاثہ نے وکیلِ صفائی کی درخواست کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ملزم کا بیان مقدمے کی فائل میں موجود ہے۔ لہٰذا اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ استغاثہ نے عدالت سے استدعا کی کہ گواہوں کے بیانات کی روشنی میں انھیں ملزم سے جرح کرنے کی اجازت دی جائے۔

عدالت نے استغاثہ کی درخواست کو رد کرتے ہوئے ملزم محمد بخش سے کہا کہ وہ اس واقعے کے بارے میں اپنا پورا بیان ایک بار پھر عدالت کے سامنے پیش کرے۔

ملزم نے سر اٹھایا اور بولا، ''جنابِ عالی! وہ سارا منظر آج بھی میری آنکھوں میں زندہ ہے۔ جب حفاظتی بند ٹوٹنے کے بعد میری امدادی کشتی اپنی مہم پر روانہ ہوئی تو دریا بپھرا ہوا تھا اور اس کی طوفانی لہریں ہر لمحے کسی نہ کسی نئی بستی کو ہڑپ کر رہی تھیں۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن بارش تھمی ہوئی تھی۔ ہمیں سیلاب زدہ علاقوں کا فضائی جائزہ لینے والے ہیلی کوپٹروں سے ہدایت کی گئی تھی کہ آگے بڑھ کر اس قصبے میں امدادی کارروائی کی جائے جو دریا کا پشتہ ٹوٹنے کے بعد زیرِ آب آگیا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کے اپنے ایک رضا کار ساتھی کی مدد سے کشتی کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ دریا کی

لہریں کافی تیز تھیں مگر ہم آگے بڑھتے رہے۔ کافی دور جانے کے بعد ڈوبے ہوئے آموں کے ایک باغ کے پیچھے ہمیں بستی کے مکانات نظر آئے جو سب کے سب پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے شام اندھیری ہوگئی تھی۔ مکانوں کی چھتوں پر کہیں کہیں پرچھائیاں ڈول رہی تھیں۔ قریب جانے پر پتا چلا کہ وہاں آدمی بھی تھے اور جانور بھی۔ گائیں، بھینسیں، بکریاں اور کتے... ایسا عجیب منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ہم تھوڑا اور آگے گئے تو ایک کچا گھر نظر آیا جو آہستہ آہستہ چونے کی ڈلی کی طرح پانی میں گھل رہا تھا۔ اس کی چھت کا چھپر بڑے خطرناک طریقے سے جھکا ہوا تھا اور کسی وقت بھی گر سکتا تھا کیوں کہ دریا کی بپھرتی لہریں مسلسل اس پر کمندیں پھینک رہی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ اس کے جھکے ہوئے چھپر پر کئی پرچھائیاں ہاتھ ہلا ہلا کے ہمیں اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ اس ڈوبتے مکان سے ذرا ہٹ کے ایک بڑی حویلی تھی، کافی بڑی اور نسبتاً پختہ۔ اس کی چھت پر بھی بہت سے سائے آپس میں گڈمڈ نظر آئے۔ میں نے حالات کا جائزہ لیا اور پہلے گرتے ہوئے کچے مکانوں کی طرف بڑھا۔ وہاں پانی بہت گہرا تھا۔ ہم اپنی کشتی کو مکان کی پشت پر لے گئے اور اسے دیوار کے ساتھ لگا کے اوپر والوں کو کشتی میں اترنے میں مدد دی۔ پرچھائیاں قریب آئیں تو میں نے دیکھا، وہ کل پانچ افراد تھے۔ ایک بچہ، ایک بوڑھا شخص، ایک جوان مرد اور دو عورتیں۔ ان میں ایک بوڑھی اور دوسری جوان عورت تھی جو شاید حاملہ بھی تھی۔ بوڑھے نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس کی بہو کو طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا کہ ابھی کشتی میں کچھ اور لوگوں کی گنجائش موجود تھی، اس لیے میں اگلے مکان کی طرف بڑھا تا کہ دوسروں کو بھی کشتی میں بٹھا لوں۔ بس ساری گڑبڑ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔''

اچانک استغاثہ کا وکیل اپنی نشست سے کھڑا ہوا اور عدالت کو مخاطب کر کے بولا، ''جنابِ عالی! ملزم کو اپنے بیان میں لفظ 'گڑبڑ' کی تشریح کرنے کو کہا جائے کیوں کہ اس کا ملزم کے برتاؤ سے خاص تعلق ہے جو اس نے دیگر متاثرینِ سیلاب سے روا رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں ساری گڑبڑ خود ملزم کے رویے کی وجہ سے ہوئی، گواہوں نے

یہی بتایا ہے!''

عدالت نے وکیلِ استغاثہ کو خاموش رہنے کی ہدایت دے کر ملزم کو اپنا بیان جاری رکھنے کی ہدایت کی۔

ملزم نے کہنا شروع کیا، ''جنابِ عالی! میں کشتی لے کر دوسرے مکان کی طرف بڑھا جس کی چھت پر سے شور وغل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہاں پر چھائیاں ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔ میں نے اعلان کیا کہ کشتی میں صرف بارہ آدمی آسکتے ہیں، لہٰذا کچھ لوگ نیچے آجائیں اور باقی دوسری کشتی آنے کا انتظار کریں مگر وہاں کوئی بھی میری بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ سب لوگ کشتی میں سوار ہونا چاہتے تھے۔ میں نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ کشتی میں پہلے سے کچھ لوگ موجود ہیں جس کی وجہ سے اوپر والے سارے لوگ اس میں نہیں سما سکتے۔

ایک آدمی غصے سے بولا، 'سب آسکتے ہیں اگر...'

'اگر...' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اگر... یہ کہ جو لوگ کشتی میں سوار ہیں، انھیں نیچے اتار دیا جائے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

'یہ کیسے ہوسکتا ہے؟' میں نے حیران ہو کے کہا۔

'ہوسکتا ہے۔' اوپر والے چیخے، 'ان لوگوں کو نیچے اتارو۔'

میں نے کہا، 'ہرگز نہیں، میں کسی کو نیچے نہیں اتار سکتا۔'

'نہیں، تمھیں یہی کرنا پڑے گا۔' پرچھائیاں خوف ناک لگنے لگیں، 'یہ لوگ ہم سے پہلے نہیں جاسکتے کیوں کہ...'

''کیوں کہ... کیوں کہ... کیوں کہ... وہ بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کی آوازیں بدل گئی تھیں۔ پھر اچانک دریا نے کشتی کو دھکا دیا... مجھے پتا نہیں کب کشتی اپنے واپسی کے سفر پر روانہ ہوئی۔ میرے تو ہوش وحواس ہی جاتے رہے تھے۔''

وکیلِ استغاثہ پھر کھڑا ہوا اور عدالت کو مخاطب کرکے بولا، ''جنابِ عالی!

ملزم نے اعترافِ جرم کرلیا ہے کہ وہ کشتی لے کر موقعے سے فرار ہوگیا تھا۔ اس نکتے کو نوٹ کیا جائے!''

وکیلِ صفائی نے اعتراض کیا، ''معزز عدالت کے سامنے ابھی میرے موکل کا بیان مکمل نہیں ہوا ہے اور میرے موکل نے کوئی اعترافِ جرم نہیں کیا۔ اس نے صرف اس روز پیش آنے والی صورتِ حال بیان کی ہے تاکہ عدالت کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو، وکیلِ استغاثہ کو ہدایت کی جائے کہ وہ میرے موکل کے بیان میں بار بار دخل اندازی نہ کریں۔''

عدالت کے اشارے پر وکیلِ استغاثہ بیٹھ گئے اور ملزم نے پھر سے اپنا بیان شروع کیا، ''میں معزز عدالت کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس دن جو بھی واقعات پیش آئے، وہ میں نے سچ سچ بیان کردیے ہیں۔ میں نے لوگوں کو کشتی میں سوار ہونے میں مدد دی اور میں کسی کو وہاں چھوڑ کے نہیں آنا چاہتا تھا، بس میں یہی کہنا چاہتا تھا۔''

وکیلِ استغاثہ نے عدالت سے درخواست کی کہ انھیں ملزم سے جرح کرنے کی اجازت دی جائے۔ معزز جج نے اثبات میں سر ہلایا تو وکیل صاحب ملزم کے کٹہرے کے عین سامنے جا کھڑے ہوئے اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کے بولے:

''اگر تم لوگوں کو وہاں چھوڑ کے نہیں آئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، اپنی کشتی میں!''

''جی جناب، مجھے یاد ہے، کچھ لوگ تھے۔'' ملزم نے سر اٹھایا اور وکیلِ استغاثہ کو دیکھا۔

''کون سے لوگ؟'' وکیلِ استغاثہ نے پھر سوال کیا۔

''وہی جو میری کشتی پر سوار تھے۔'' ملزم نے جواب دیا۔

وکیلِ استغاثہ نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا، ایک بار پھر ملزم کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کے بولا، ''میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمھارا عقیدہ کیا ہے؟''

وکیلِ صفائی نے کھڑے ہوکر اعتراض کیا، ''اس سوال کا مقدمے سے کوئی تعلق

نہیں ہے، میں معزز عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ وکیلِ استغاثہ کو ملزم سے یہ سوال کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔''

وکیلِ استغاثہ نے اصرار کیا، ''یہ سوال جرم کی سنگینی کو ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے اپنا سوال کرنے دیا جائے!''

عدالت نے رضامندی کا اظہار کیا تو وکیلِ استغاثہ نے پھر اپنا سوال دُہرایا، ''کیا بتاؤ گے کہ تمھارا دین کیا ہے؟ چلو میں اپنا سوال تھوڑا سا بدل دیتا ہوں، بتاؤ کیا تم مسلمان ہو؟''

''الحمدللہ۔'' ملزم نے جواب دیا، ''مگر اس سوال کا مقصد؟''

'' کیسے مسلمان ہو؟'' وکیلِ استغاثہ نے پھر پوچھا۔

ملزم مسکرایا، ''جیسے آپ مسلمان ہیں، جیسے کمرۂ عدالت میں موجود تمام مسلمان، مسلمان ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کا نام لیوا ہوں، نمازیں کچھ پڑھتا ہوں، کچھ نہیں پڑھتا، روزے بھی کچھ رکھتا ہوں، کچھ نہیں رکھتا، اچھے عمل کرنا چاہتا ہوں مگر کوشش کے باوجود کبھی کبھی اچھے کام نہیں ہو پاتے۔ مگر ہوں مسلمان۔ اب یہ سوال مت داغیے گا کہ مسلک کیا ہے، حنفی یا جعفری، دیوبندی، بریلوی یا اہلِ حدیث۔ یہ معاملات میری سمجھ میں نہیں آتے۔ اور پھر ان باتوں کا مقدمے سے کیا تعلق ہے؟''

''تعلق اس لیے بنتا ہے کہ آپ کے خلاف گواہوں نے جو بیانات دیے ہیں، اس میں انھوں نے کہا ہے کہ آپ نے کسی خاص وجہ سے وہاں لوگوں کے ساتھ جھگڑا کیا ہے اور انھیں زندگی اور موت کی کش مکش میں چھوڑ کے وہاں سے چلے آئے۔''

وکیلِ صفائی نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''جنابِ عالی! استغاثہ کے اس سوال کا مقصد مقدمے کو الجھانا ہے حالاں کہ انھیں ایسے دلائل پیش کرنے چاہییں جن سے ثابت ہوسکے کہ ملزم نے اپنے فرض کی ادائیگی میں غفلت برتی ہے۔''

استغاثہ کے وکیل نے جواب دیتے ہوئے کہا، ''یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ ملزم نے اپنے فرض کی ادائیگی میں نہ صرف غفلت کا مظاہرہ کیا بلکہ جان بوجھ کے بہت

سے لوگوں کو سیلاب کے ریلے میں ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کا اعتراف ملزم خود اپنے منہ سے کر چکا ہے مگر عدالت کے لیے ضروری ہے کہ وہ جاننے کی کوشش کرے کہ ملزم نے ایسا کیوں کیا، خاص طور پر اس وقت جب حالات اتنے خراب تھے اور سیلابی پانی سب کچھ بہا لے گیا تھا اور بہت سی جانیں اس کے رحم و کرم پر تھیں۔''

ملزم نے جج صاحب کو دیکھا اور کہا، ''میں معزز عدالت کی اجازت سے وکیلِ استغاثہ کی اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ حالات واقعی اتنے خراب تھے کہ کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اتنا پانی کب کسی نے دیکھا ہوگا، طوفانِ نوح کے وقت سے۔ کچھ باقی نہیں بچا، سب کچھ بہہ گیا۔ صبر و تحمل، برداشت، رواداری، بس پرچھائیاں رہ گئیں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں جناب۔ آخری بار جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تو وہ سب زور زور سے بول رہے تھے مگر مجھے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ مجھے بس غراہٹیں سنائیں دیں۔ ایک بار میں نے گھبرا کے اوپر دیکھا تو چھت کی منڈیر پر مجھے جانوروں کے سر نظر آئے۔ نوکیلے سینگوں اور لمبے دانتوں والے، پھر کشتی چل پڑی۔ ہمارا سفر بہت خطرناک تھا۔ شام گدلی اور اندھیری تھی۔ سارا راستہ ہم نے تاریکی میں طے کیا۔''

وکیلِ استغاثہ نے غصے سے کہا، ''اور تم خالی کشتی سمیت بھاگ کھڑے ہوئے۔''

ملزم نے ٹھنڈا سانس بھرا اور ہاتھ جوڑ کے بولا، ''نہیں جناب! کچھ لوگ تو میرے ساتھ آئے تھے جن کے متعلق کہا جا رہا تھا کہ وہ، وہ تھے، وہ... وہ نہیں تھے۔ پتا نہیں سرکار وہ، وہ تھے یا وہ، وہ نہیں تھے!''

وکیلِ استغاثہ نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''ملزم کے بیان سے حقیقت سامنے آگئی ہے اور یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اس نے بہت سے لوگوں کو جان بوجھ کے کشتی میں سوار نہیں ہونے دیا۔ اسے اپنے جرم کی قرار واقعی سزا دی جائے۔''

وکیلِ صفائی نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ ان کے مؤکل نے پوری سچائی کے ساتھ اپنا بیان مکمل کر دیا ہے جس سے اس کی بے گناہی ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ انصاف کیا جائے۔

معزز عدالت نے دونوں وکیلوں کے دلائل مکمل ہونے پر اجلاس کو برخاست کرنے کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ مقدمے کا فیصلہ کچھ دیر بعد سنایا جائے گا۔

عدالت کے باہر بہت سارے احتجاجی جمع تھے جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے بینر اٹھا رکھے تھے جن پر ملزم کے خلاف نعرے درج تھے اور اسے عبرت ناک سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

روٹی اور سانپ

امدادی کیمپ میں پناہ گزینوں کے لیے کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا اور کھانے کے اسٹال کے سامنے لوگوں کی بڑی لمبی سی قطار کسی سانپ کی طرح لہرا کے دور تک چلی گئی تھی مگر قطار سے پرے وہی شخص لاتعلقی سے کھڑا تھا جسے کیمپ کے نگراں نے انتظامیہ کے کارکنوں سے صبح کے وقت بُری طرح جھگڑتے اور ہنگامہ کرتے دیکھا تھا۔

''کون شخص ہے یہ؟'' کیمپ کے نگراں نے ایک رضا کار سے پوچھا۔

''پاگل ہے کوئی۔'' رضا کار نے ہنس کے جواب دیا، ''کہتا ہے وہ خیمے میں نہیں رہے گا۔ اسے سونے کے لیے بستر نہیں چاہیے، کوئی کمبل، کوئی برتن، پانی پینے کے لیے کوئی گلاس، اسے کچھ نہیں چاہیے، حالاں کہ جتنے لوگ اس کیمپ میں آئے ہیں، انھوں نے کیمپ کی انتظامیہ کا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ انھیں ضرورت کی ہر چیز چاہیے کیوں کہ ان کا سارا اثاثہ، گھر بار، کھڑی فصلیں اور اناج کے ذخیرے سیلاب کی نذر ہو گئے ہیں مگر یہ شخص عجیب ہے، اسے کچھ نہیں چاہیے۔ کہتا ہے اگر دینا ہے تو اسے اس کا بیٹا دلا دو جو کہیں کھو گیا ہے۔''

نگراں نے کہا، ''اس میں کوئی شک نہیں، سیلاب کی آفت نے گھر اجاڑ دیے ہیں، لوگوں کے بچے کھو گئے ہیں، میاں بیوی بچھڑ گئے ہیں۔ اسے سمجھاؤ کہ ہم سرکاری ذرائع کو کام میں لاتے ہوئے اس کے بیٹے کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ ہوسکتا ہے وہ

کسی اور لاری میں بیٹھ گیا ہو اور کسی اور کیمپ میں پہنچ گیا ہو۔ پانی سے گھرے گوٹھوں سے انھیں ہر طریقے سے محفوظ مقامات تک پہنچایا جا رہا ہے۔ کل رات ہی پناہ گزینوں کا ایک قافلہ خیمہ بستی میں لایا گیا ہے۔''

رضا کار ہنسا، ''بات یہ نہیں ہے سر! اس کا کوئی بیٹا ویٹا سیلاب میں نہیں پھنسا۔''

''پھر؟'' نگراں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''اصل میں اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔'' رضا کار نے کہا۔

''پھر اسے کس کی تلاش ہے، آخر کیا چاہیے بے چارے کو؟''

''اسے سانپ چاہیے۔'' رضا کار بولا۔

''سانپ؟'' نگراں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''جی ہاں، سانپ — اس کا سانپ کہیں کھو گیا ہے یا شاید فرار ہو گیا ہے، سیلاب کے ہنگامے میں — تین گز لمبا ایک کالا کوبرا — اب وہ اس کی جدائی میں مرا جا رہا ہے۔''

نگراں نے کہا، ''عجیب شخص ہے بھئی — ذرا اسے بلاؤ تو۔''

رضا کار اس آدمی کو کیمپ کے نگراں کے پاس لے آیا۔ وہ چھوٹے سے قد کا پچکے گالوں والا ایک سیاہ فام دیہاتی تھا۔ عنابی رنگ کی گول شیشوں سے سجی ہوئی ٹوپی میں سے اس کی پیشانی نظر آ رہی تھی جس پر بے شمار سوالات لکیروں کی شکل میں نمایاں تھے۔ اس نے سلیٹی رنگ کا شلوار کُرتہ پہن رکھا تھا اور پاؤں میں بلوچی چپلیں تھیں۔ کانوں میں بُندے اور گلے میں کوڑیوں اور نیلے موتیوں کی مالا۔ ایک ہاتھ میں بین تھی اور بغل میں ایک لمبا سا تھیلا۔

''حاضر سائیں،'' وہ قریب آ کے بولا، ''حکم؟''

''نام کیا ہے تمھارا؟'' نگراں نے سوال کیا۔

''دُر محمد آرائیں، میرے سائیں!'' اس نے جواب دیا۔

نگراں نے پوچھا، ''سنا ہے تمھارا سانپ کھو گیا ہے؟''

''جی سرکار!'' وہ ہاتھ جوڑ کے بولا، ''بیٹا تھا وہ میرا — یہ بڑا کالا پھن اور چمکیلی

آنکھیں— میری تو دنیا ہی اُجڑ گئی ہے مائی باپ!''

''اچھا تو تم شاید سپیرے ہو۔'' نگراں نے کہا، ''سانپ کا تماشا دکھاتے ہو گے گوٹھ میں، بین بجا کے۔''

''جی سائیں۔'' دُر محمد نے اپنی بین آگے بڑھائی جس پر نیلے موتیوں کی جھالر بجی ہوئی تھی۔ ''یہ بھی اُجڑ گئی ہے سرکار!''

''دیکھو دُر محمد! سیلاب نے لوگوں سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔'' نگراں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، ''بہت سے لوگوں کے جانور ضائع ہو گئے ہیں، بیل جو اُن کے کھیتوں پر کام کرتے تھے اور گائیں بھینسیں جن کا دودھ استعمال ہوتا تھا اور مرغیاں جن کے انڈے کام آتے تھے— اب وہ سب لوگ یہاں رہ رہے ہیں، ہماری کوشش ہے کہ کسی طرح ان کا نقصان پورا کرسکیں، ان کے جانور انھیں دلواسکیں مگر تمھارا سانپ— میرے بھائی، اسے کون واپس لائے گا۔ خیر، ابھی تھوڑا صبر کرو، کیمپ میں تمھیں ہر طرح کا آرام ملے گا۔ نرم بستر، تینوں وقت کھانا اور بیماری میں دوا دارو!''

''نہ، نہ بابا— '' دُر محمد بول پڑا، ''مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔ میرا بیٹا، میرا دلبر اب مجھے کہاں ملے گا۔ راتوں میں وہ میرے سینے پر لوٹتا اور میری گردن میں جپھی ڈالتا تھا۔ میں اس کے بغیر بالکل اکیلا ہوگیا ہوں سائیں!''

دُر محمد وہیں فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے بچھڑے سانپ کے لیے بَین کرنے لگا۔ بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے اور اسے دلاسا دینے لگے۔ ''فکر مت کر دُر محمد، تیرا ناگ تجھے مل جائے گا اور تو پھر سے بین بجائے گا اور وہ تیری بین کی لَے پر مست ہو کے پھن کاڑھے گا۔''

ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کے کہا، ''تو آدمی ہو کے ایک سانپ کے لیے روتا ہے دُر محمد، لعنت ہے۔ ارے اگر تیری بین میں دَم ہے تو ایک چھوڑ سو نئے سانپ پکڑ لے گا، ورنہ چھوڑ اس خطرناک کھیل کو۔ ارے کہیں ناگ بھی کسی کا پوت، کسی کا یار ہوتا ہے؟''

پھر ایک عورت شوخی سے بولی، ''ارے کیا پتا دُر محمد! تیرا ناگ کسی ناگن کے آنکھ

کے اشارے پر آنگن پھلانگ کے جنگل میں چلا گیا ہو۔ تو نے پتا نہیں کب سے اسے اپنی پٹاری میں بند کیا ہوا تھا۔''

مگر دُر محمد کو کسی کے چبھتے فقرے، کسی کے مذاق اور کسی کے طعنے کی پروا نہیں تھی۔ وہ میدان میں لوگوں کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوا اپنے ناگ کے بچھڑنے کا ماتم کرتا رہا۔ بچے اس کے آس پاس کھڑے اسے حیرت سے تکتے رہے۔

کھانے کا وقت آیا اور ختم ہو گیا مگر اسے کھانے پینے کی پروا نہیں تھی۔ سہ پہر میں کسی خیراتی ادارے کی جانب سے ایک ٹرک آیا جس پر آئس کریم کے ڈبے تھے اور کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں لدی ہوئی تھیں۔ لوگوں نے ٹرک پر ہلاّ بول دیا اور سب چیزیں لوٹ کے لے گئے مگر دُر محمد اپنی جگہ بت بنا بیٹھا رہا۔ اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے تو صبح سے پانی کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بہت سے نوجوان جو رضا کاروں کے ساتھ مل کے کیمپ کے انتظامات میں مصروف تھے، دوڑے دوڑے نگراں کے پاس گئے۔

''جناب! دُر محمد نے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ خیراتی روٹی نہیں کھائے گا۔'' اس وقت امدادی کارروائیوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک مقبول ٹیلی وژن چینل کی ٹیم کیمپ کا دورہ کر رہی تھی اور پناہ گزینوں کی فلم بنا رہی تھی۔ اس کے کارکنوں نے دُر محمد کی داستان سنی تو ان سب کی باچھیں کھل گئیں۔ ذرا دیر میں دُر محمد کی کہانی ملک بھر میں پھیل گئی کہ ایک غریب سپیرے نے اپنے سانپ کے حصول کے لیے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ ایک چینل نے یہ خبر دی تو دوسرے چینلوں کے کارکنان بھی اُدھر دوڑ پڑے اور چند ہی گھنٹوں میں وہاں ٹی وی کے صحافیوں اور آنکھوں دیکھا حال بتانے والے چرب زبان راویوں کا جمگھٹا لگ گیا۔ اب باری باری ہر ٹی وی چینل سے دُر محمد کا انٹرویو نشر کیا جا رہا تھا۔ ایک مقبولِ عام ٹی وی چینل 'دیکھو مجھے' کی ایک چلبلی خاتون صحافی دُر محمد سے بہت دلچسپ سوالات کر رہی تھیں۔

''آپ پہلے شخص ہیں جو کسی ناگ کو بیٹا کہتے ہیں، اگر سچ مچ میں آپ کا کوئی بیٹا ہوتا تو کیا آپ اسے ناگ کہتے؟''

"ناگ راجا کو آپ نے اتنا مشہور کر دیا ہے کہ اگر وہ واپس آ گیا تو اشتہاری کمپنیاں اسے اپنے اشتہاروں میں استعمال کریں گی، بے لوث محبت کی علامت کے طور پر—"

"لوگوں نے پہلے ناگ کے ڈسنے سے بہت آدمی مرتے دیکھے ہوں گے مگر ناگ کے کاٹے بغیر ناگ کی وجہ سے کسی کو مرتے دیکھنا بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔ سب لوگ چاہتے ہیں کہ آپ بھوک ہڑتال ختم کر دیں۔"

ٹی وی کے ذریعے ناگ راجا کے کھو جانے اور سپیرے دُر محمد آرائیں کی بھوک ہڑتال کی خبر پھیلنے اور پھر دُر محمد کی بات چیت نشر ہونے سے شہروں میں اس کے بہت سے حمایتی گروپ بن گئے جن میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شامل تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی شہروں میں احتجاجی سڑکوں پر نکل آئے جن کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بینر تھے جن پر تحریر تھا، "دُر محمد کے ناگ بیٹے کو واپس لاؤ، اس کی بھوک ہڑتال ختم کراؤ۔" کئی نوجوانوں نے کپڑے اور پلاسٹک کے بنے ہوئے نقلی سانپ بھی اپنے سروں پر اٹھا رکھے تھے۔ یہ احتجاجی مظاہرے اتنی شدت اختیار کر گئے کہ کئی مقامات پر امن و امان برقرار رکھنے کے لیے ان پر لاٹھی چارج بھی کیا گیا۔

ٹیلی وژن کی خبروں میں دُر محمد کی بھوک ہڑتال اور متعلقہ تصویریں، رپورٹیں دکھائے جانے سے عام لوگوں کو بھی اس معاملے میں دلچسپی پیدا ہوئی اور کئی ایک ٹی وی چینلوں پر کوبرا ناگ کے بارے میں دستاویزی فلمیں بھی پیش کی گئیں کہ کوبرا کیا ہوتا ہے، اس کی شکل و صورت کیسی ہوتی ہے، وہ کتنا زہریلا ہوتا ہے اور کن علاقوں میں پایا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دُر محمد سپیرے کی بھوک ہڑتال کی خبر سے شہروں میں جو ہلچل مچی اور جو احتجاجی مظاہرے ہوئے ان کی دھمک حکومت کے ایوان میں بھی پہنچی اور صوبے کے وزیرِ اعلیٰ نے کابینہ کی ایک میٹنگ کے بعد اخبار نویسوں کو بتایا کہ حکومت دُر محمد سپیرے کے لیے چڑیا گھر کے سرکاری سانپ خانے سے فوری طور پر ایک سانپ بھیجنے پر غور کر رہی ہے۔

امدادی کیمپ میں صحافیوں نے دُر محمد کو بتایا کہ پورے ملک میں اس کی حمایت میں

مظاہرے کیے جا رہے ہیں اور حکومت پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ اس کی بھوک ہڑتال ختم کرائی جائے۔

دُرمحمد نے کہا، ''میں اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں گا جب تک کہ سانپ کی پٹاری پھر سے آباد نہیں ہو جاتی۔ پتا نہیں وہ کہاں گیا— میرا بیٹا— میرا کماؤ پوت!''

کچھ اور وقت گزرا تو امدادی کیمپ کی انتظامیہ کو حکومت کی جانب سے یہ پیغام موصول ہوا کہ بعض اہم مصروفیات کی وجہ سے وزیرِ اعلیٰ خود تو کیمپ کا دورہ نہیں کر سکتے مگر ان کی جانب سے ایک صوبائی وزیر اور متعلقہ سیلاب زدہ علاقے کے منتخب نمائندے کو دُرمحمد سپیرے سے ملنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے تاکہ اسے یقین دلایا جا سکے کہ اس کا سانپ جلد سے جلد اس کے حوالے کر دیا جائے گا تاکہ وہ اپنا کام پھر سے شروع کر سکے۔

شام سے پہلے حکومت کے نمائندے بھی کیمپ میں پہنچ گئے۔ وہ اپنی لال پجیرو سے اتر کے سیدھے کیمپ کے اس حصے میں آ گئے جہاں سپیرے دُرمحمد کے گرد ایک مجمع لگا تھا اور ٹیلی وژن کیمروں اور اخباری رپورٹروں کی بھرمار تھی۔

کیمپ کے نگراں نے لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے آنے والے صوبائی وزیر اور سیلاب زدہ علاقے کے منتخب نمائندے کو دُرمحمد کے پاس پہنچایا۔

دُرمحمد کی رنگ برنگی پوٹلی جس میں سانپ کی خالی پٹاری تھی، اس کے پہلو میں رکھی تھی اور نیلے موتیوں کی جھالر والی بین اس کی گود میں دھری تھی۔

کیمپ کے نگراں نے کہا، ''دیکھو دُرمحمد! حکومت نے تمھارے لیے ایک وفد یہاں بھیجا ہے۔ وزیر صاحب آگے آئیے۔'' انھوں نے کہا، ''یہ ہے ہمارا دُرمحمد جس نے اپنے سانپ کی خاطر کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ ایم پی اے صاحب آپ بھی یہاں تشریف لائیں۔ یہ خاص آپ کے علاقے کا بندہ ہے، اس کی مدد کریں۔''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔'' وہ دونوں آگے بڑھے۔ دُرمحمد نے چہرہ اوپر اٹھایا اور دونوں کو غور سے دیکھا۔

''تمھیں تمھارا سانپ ضرور ملے گا۔'' وزیر صاحب نے کہا، ''ہماری حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ سارے مصیبت زدہ لوگوں کی بھرپور مدد کی جائے گی اور سیلاب سے لوگوں کا

جو بھی نقصان ہوا ہے، وہ پورا کیا جائے گا۔''

''تو کدھر ہے میرا سانپ؟'' دُرمحمد نے پوچھا، پھر اس نے بین اٹھائی اور اسے بجانے کے لیے منہ کے پاس لے گیا۔

''ابھی بین مت بجاؤ۔'' دونوں گھبرا کے بولے، ''ابھی ہم صرف تمھیں بھوک ہڑتال ختم کرنے کے لیے راضی کرنے آئے ہیں۔ لاؤ بھئی، اس کے لیے کچھ لے کر آؤ کھانے پینے کو!''

فوراً ہی کچھ رضا کار دوڑ کے کاغذی پلیٹوں میں کچھ بسکٹ اور نمک پارے، بریانی کا ڈبا، آئس کریم اور پانی کی بوتلیں لے آئے۔

دُرمحمد چپ چاپ بیٹھا بے نیازی سے اپنی بین کے ساتھ کھیلتا رہا۔

وزیر صاحب نے پھر بات چیت شروع کی، ''ادا دُرمحمد! شکر کرو تمھارا کام بن گیا، لو اب مانی کھاؤ اور پانی شانی پیو!''

دُرمحمد نے سوالیہ نگاہوں سے کیمپ کے نگراں کو دیکھا، ''اور سانپ؟''

''آجائے گا، وہ بھی آجائے گا۔'' ایم پی اے صاحب نے اپنی سیاہ لمبی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا جس کے دونوں سرے ناگ کے پھنوں کی طرح اٹھے ہوئے تھے۔

دُرمحمد نے پھر ہر طرف نظر دوڑائی اور بولا، ''سانپ بھی نہیں، روٹی بھی نہیں!''

''روٹی لاؤ، روٹی لاؤ۔'' نگراں نے رضا کاروں کو حکم دیا۔ ایک بار پھر وہاں بھاگ دوڑ مچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے ایک رضا کار امدادی کیمپ کے ہنگامی تندور سے بڑی سی ایک گرما گرم روٹی ہاتھ میں لے کر دوڑتا ہوا آیا۔

''یہ لو روٹی۔'' رضا کار بولا۔

دُرمحمد نے اپنی پوٹلی کھول کے سانپ کی خالی پٹاری باہر نکالی اور ڈھکن ہٹا کے سامنے رکھ دی، ''روٹی اس میں رکھ دو'' وہ بولا۔ پھر اس نے بین اٹھائی اور اسے منہ سے لگا کے زور زور سے بجانے لگا۔ روٹی تازہ تھی اور پھنکار رہی تھی۔

امدادی کیمپ

تھانے دار محمد بچل پانی میں ڈوبے ہوئے آدھے شہر کا چکر لگا کے لوٹا تو تھانے کے احاطے میں ضلعی پولیس کی گاڑیاں نظر آئیں اور پھر جب وہ اپنے دفتر میں داخل ہوا تو وہاں سینئر ایس پی امداد علی شاہ کو کسی بُری خبر کی طرح تھانے پر مسلط پایا۔ بڑے افسروں کے اچانک اس طرح آنے سے اسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اپنے کام میں خوامخواہ کسی کی دخل اندازی اسے پسند نہیں تھی۔ بہرحال اس وقت اس ناگہانی سے تو اسے نمٹنا ہی تھا۔ اس نے آگے بڑھ کے ایس پی صاحب کو زور کا سلیوٹ مارا اور مصنوعی خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا، ''زہے نصیب سرکار — بڑے اچھے وقت حضور نے یہاں آنے کی تکلیف کی۔ دریا سائیں کے ناراض ہونے کے بعد یہاں تو ساری بستی خالی ہوگئی ہے، اس لیے گھروں کی دیکھ بھال کے لیے پولیس کی نفری بڑھانے کی ضرورت ہے۔''

ایس پی مسکرایا، ''اسی لیے تو آیا ہوں کہ ذرا اپنی آنکھ سے بھی تو دیکھوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اوپر اطلاع ملی ہے کہ سیلاب کے علاقے میں ابھی بہت لوگ اپنے گھروں میں بند ہیں اور جہاں گھر خالی ہیں، وہاں چور اُچکوں کے مزے آگئے ہیں۔''

''نا سائیں نا —'' تھانے دار بولا، ''مجال ہے چوروں کی جو ادھر کا رُخ کریں۔ کچے میں تو پہلے ہی دریا نے ان کی پناہ گاہیں مٹا دی ہیں۔ رہ گیا شہر، تو سرکار میں نے پہلے

ہی ہر طرف پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ شہر کے ان علاقوں میں بھی جہاں دریا کے قدم ابھی نہیں پہنچے۔ پہرے کا پورا انتظام ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد گھڑسوار دستہ ادھر کا چکر لگا لیتا ہے!''

''اچھا!'' یہ سن کے بڑی خوشی ہوئی۔'' ایس پی امداد علی شاہ نے کہا، ''مگر وڈیرے دودا خان نے تو عجیب درخواست بھیجی ہے کمشنر صاحب کو— اس کا کہنا ہے کہ اس کے علاقے کے متاثرین کو بالکل نہیں پوچھا جا رہا۔ کتنے ہی لوگ ہیں جن کا کاروبار سیلاب بہا کے لے گیا ہے مگر ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ اس لیے رضا کاروں کے دستے ان کی مدد کے لیے فوری طور پر بھیجے جائیں!''

''اچھا— وڈیرے دودا خان نے ایسی کوئی درخواست اوپر بھیجی ہے، مجھے پتا نہیں تھا—'' تھانے دار محمد بچل نے کہا، ''وڈیرے کا پورا گوٹھ پانی کے اندر ہے مگر وہ بادشاہ آدمی ہے، اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے تو شہر میں بہت مکان ہیں اور بہت ساری اراضی دیگر مقامات پر بھی ہے، اسے اپنی فکر تو نہیں ہونی چاہیے لیکن پھر بھی جن متاثرین کے بارے میں اس نے فریاد کی ہے، وہ کہاں ہیں، خود اس سے پتا کرنا پڑے گا۔ میرے آدمیوں کو تو گشت کے دوران کوئی متاثرین نظر نہیں آئے۔ انھیں ملیں بھی تو دو ایک بیمار بکریاں یا کچھ لاوارث مرغیاں۔''

ایس پی امداد علی شاہ نے کہا، ''شکر ادا کرو— دریا آدھے راستے میں ٹھہر گیا ورنہ آج تم بھی اپنے تھانے سمیت کسی امدادی کیمپ میں ہوتے۔''

تھانے دار محمد بچل ہنسا، ''یہ تو آپ سچ کہہ رہے ہیں سرکار— جب دریا کا بند ٹوٹا تو شہر کو فوراً خالی کرنے کا اعلان کر دیا گیا تھا، پھر کیا تھا لوگ گھوڑا گاڑیوں، چھوٹی بڑی بسوں اور لاریوں میں سوار ہو کے باہر جانے والے راستوں پر چل پڑے۔ ان کے ساتھ ڈھور ڈنگر بھی تھے۔ گائیں بھینسیں اور بھیڑ بکریاں— یہاں تک کہ ان کے کتے بھی— بیل گاڑیوں پر مرغیوں اور بطخوں کے ٹوکرے بھی لدے تھے۔''

''تو تمھارے خیال میں شہر پورا خالی ہو گیا تھا اسی وقت؟'' ایس پی امداد علی شاہ نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''بالکل جناب! کچھ ہی دیر پہلے ایک پولیس پارٹی گشت سے واپس آئی ہے، اسے آج بھی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، نہ کوئی ملا— البتہ دو گھنٹے پہلے تین مرغیاں ضرور تھانے کے باورچی خانے میں لائی گئی ہیں۔ بہترین چکن کڑھائی تیار ہوگا سرکار— ہمارے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہوگی، اگر آپ رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں۔''

''غضب خدا کا، تم مجھے بس ان لاوارث مرغیوں پر ٹرخانا چاہتے ہو۔'' ایس پی امداد علی شاہ نے ہنس کے کہا، ''اس سے تو بھوکا ہی بھلا ہوں میرے بھائی۔ ویسے اور کچھ بھی کھانے کو ہے تیرے تھانے میں؟''

''کیوں نہیں سرکار!'' تھانے دار محمد بچل اپنی مونچھیں اینٹھ کے بولا، ''آپ حکم کریں تو وڈیرے دودا خان کو فون کھڑکاؤں۔ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور چکن بریانی کی دیگ تھانے میں بھیجتا ہے۔''

''مگر اب تو سیلاب کی مصیبت آئی ہوئی ہے نا بھائی۔'' ایس پی امداد علی شاہ بولا، ''اب تو بے چارے کو معاف کردو، بلکہ چلو ذرا چل کے ملتے ہیں وڈیرے سے— آخر مرد آدمی چاہتا کیا ہے؟''

پھر دونوں تھانے سے نکلے اور پولیس کی گاڑیوں میں سیلاب زدہ علاقے کی طرف چلے۔ ''گاڑیاں کچھ دور تک جاسکتی ہیں مگر پھر انھیں چھوڑنا ہوگا اور پیدل ہی آگے جانا ہوگا۔'' تھانے دار محمد بچل نے کہا، ''وڈیرے کا تو سارا گوٹھ ڈوبا ہوا ہے مگر اس نے فی الحال اپنی بارہ دری میں ڈیرا جما رکھا ہے جو نہر کے کنارے کھجوروں کے باغ میں واقع ہے۔''

سیلابی پانی کی عمل داری شروع ہوتے ہی، پولیس کی گاڑیاں روک دی گئیں اور تھانے دار محمد بچل، ایس پی امداد علی شاہ کے ساتھ لکڑی کا ایک عارضی پل عبور کر کے کھجوروں کے باغ میں داخل ہوا۔ سامنے ہی بارہ دری تھی جس میں ہنگامی خیمے اور چھولداریاں نظر آ رہی تھیں۔

پولیس والوں کو اندر آتے دیکھ کے وڈیرے کے دو ملازم تیزی سے ایک

چھول داری سے باہر نکلے۔

''سلام سائیں!'' انھوں نے آگے بڑھ کے تھانے دار اور ایس پی بہادر کے گھٹنے چھوئے۔ ''بڑی تکلیف کی آپ نے — راستے میں پانی ہی پانی ہے۔''

تھانے دار محمد بچل نے پوچھا، ''وڈیرا دودا خان موجود ہے کیا؟''

''کیوں نہیں سرکار!'' ایک کارندے نے جواب دیا، ''ابھی ابھی بارہ دری کا چکر لگا کے اوطاق میں گیا ہے وڈیرا — اندر چلیں سرکار!''

دونوں اندر داخل ہوئے۔ وڈیرا بڑے سے جھولے پر تقریباً لیٹا ہوا تھا۔ وہ انھیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آہا، کتنی خوشی کی بات ہے۔'' وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کے بولا، ''مجھے نہیں پتا تھا کہ ہماری پولیس اتنی مستعد ہے، اِدھر مدد کے لیے پکارو، اُدھر موجود — ابھی میں نے کل ہی تو کمشنر صاحب کو چٹھی بھیجی تھی کہ...''

ایس پی امداد علی شاہ نے وڈیرے سے ہاتھ ملایا اور ہنس کے بولا، ''بالکل سائیں — اسی لیے تو میں آیا ہوں۔ دیکھوں تو یہاں سیلاب نے کیا آفت ڈھائی ہے۔ ویسے تو تھانے دار صاحب نے بھی بڑا اچھا کام کیا ہے علاقے میں — کسی مصیبت کے مارے کو بے یار و مددگار نہیں رہنے دیا۔''

''جیئں تھانے دار اور اس کے سارے سپاہی۔'' وڈیرے نے کہا، ''بڑے بھلے لوگ ہیں یہ سب، کسی کو ان سے شکایت نہیں۔'' اس نے پولیس افسران کو سامنے رکھے مونڈھوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ایس پی امداد علی شاہ نے پھر بات شروع کی، ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے اپنی بارہ دری خالی کر دی ہے سیلاب زدگان کے لیے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔''

فوراً ہی ایک کارندہ مہمانوں کے لیے چائے کی پیالیاں، سموسے اور کھجوریں میز پر سجا کے چلا گیا۔

وڈیرے نے کہا، ''میں نے کمشنر صاحب کو لکھا تھا کہ ادھر بھی بہت سیلاب کے مارے لوگ امداد کے منتظر ہیں۔''

''ہاں وہی تو...'' تھانے دار محمد بچل بیچ میں بول پڑا، ''میں نے شہر کا سروے کیا تھا۔ وہاں تو...''

ایس پی امداد علی شاہ نے بات آگے بڑھائی، ''تھانے دار صاحب کا خیال ہے کہ ادھر سے تو سب لوگ پہلے ہی دوسری جگہوں پر منتقل ہو چکے ہیں۔''

''کدھر سائیں؟'' وڈیرے نے کہا، ''بہت لوگ ابھی باقی ہیں، بڑی مصیبت میں ہیں، بے چارے غریب لوگ— اسی لیے تو میں نے لکھا تھا کہ سرکار کو چاہیے کہ...''

''ضرور— ضرور—'' ایس پی امداد علی شاہ نے کہا، ''امداد ضرور ملے گی، بس پتا چلے کہ وہ کتنے لوگ ہیں اور کہاں ہیں۔ کیا وہ آپ کی بارہ دری میں...''

''ابھی نہیں، یہی تو بات ہے۔'' وڈیرے نے کہا، ''میں نے تو بارہ دری کھول دی ہے۔ اب یہ آپ لوگوں کا فرض ہے کہ انھیں یہاں تک پہنچنے میں مدد کریں۔''

''مگر وہ ہیں کہاں؟'' ایس پی نے پھر سوال اٹھایا۔

''ارے بھئی اسی بستی میں اور کہاں؟'' وڈیرے نے کہا، ''آپ لوگ میرے آدمی کے ساتھ ادھر جاؤ اور انھیں...''

تھانے دار محمد بچل نے کہا، ''یہ ٹھیک ہے ہم لوگ اب شہر ہی کی طرف جا رہے ہیں، اپنے آدمی کو ہمارے ساتھ بھیجیں تاکہ پتا چلے کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔''

وڈیرے نے خوش ہو کے سر ہلایا اور اپنے کارندے کو آواز دی، ''مٹھل— او مٹھل، ذرا صاحب لوگوں کے ساتھ شہر کا چکر تو لگا— انھیں تو پتا ہی نہیں ہے کہ کتنے لوگ وہاں ابھی ہنگامی امداد کے انتظار میں ہیں۔''

پولیس کے حکام وڈیرے کی اوطاق سے باہر نکلے اور مٹھل کے ساتھ شہر کی طرف چلے۔ مٹھل نے پولیس کی ایک گاڑی میں سپاہیوں کے ساتھ اپنے لیے جگہ بنا لی اور قافلے کی رہنمائی کا فرض نبھانے لگا۔

اب شام گہری ہو چلی تھی۔ پولیس کی گاڑیاں پانی میں رینگتی شہر کے اندرونی علاقوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پانی کے باہر بھی شہر سنسان پڑا تھا۔ گھر خالی اور راستے

ویران، گلیاں بھائیں بھائیں کرتی ہوئی جن میں مکانات ایک دوسرے کے کندھوں پر سر جھکائے ایسے اداس کھڑے تھے جیسے حالات پر نادم ہوں۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔

تھانے دار محمد بچل نے کہا، ''سرکار میں نے بتایا تھا نا کہ پانی کے خوف نے سارے شہر کو پتھر کا بنا دیا ہے، کہیں کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں۔''

مگر عین اسی وقت جب تھانے دار محمد بچل شہر کو بالکل گونگا بتا رہا تھا، ایس پی امداد علی شاہ نے کہیں دور ایک آواز سنی — کسی کے گانے کی آواز۔

''کیا میرے کان بج رہے ہیں یا ہوا کی سیٹیاں اچانک کسی گیت میں ڈھل گئی ہیں؟'' ایس پی نے خود سے کہا، ''تم نے کچھ سنا؟'' پھر اس نے تھانے دار محمد بچل سے پوچھا۔

''نہیں تو سرکار۔'' تھانے دار بچل نے جواب دیا اور اپنی ٹوپی سر پر گھمائی۔

شام مزید کالی ہوگئی تھی اور گلیوں میں ہر طرف سیلابی پانی کی سیلی ہوئی بو پھیلی ہوئی تھی۔

ایس پی نے پھر کہا، ''کوئی گا رہا ہے شاید — کوئی عورت — مگر یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟'' آگے والی گاڑی ایک گلی کے باہر رک گئی۔ سامنے ہی ایک مکان تھا جس کی بالائی منزل پر ساگون کی لکڑی کے منقش دریچے اگرچہ بند تھے، پھر بھی بول رہے تھے، ''یہ مکان خالی تو نہیں لگتا۔'' وہ بولا۔

تھانے دار نے جواب دیا، ''حیرت ہے، پہلے تو خالی تھا، کبھی کوئی آواز اس گلی میں سنائی نہیں دی۔''

اسی لمحے بند دریچوں کے پیچھے روشنی جھلملانے لگی۔ تھانے دار نے اچنبھے سے کہا، ''شہر میں تو بجلی بھی غائب ہے، پھر یہ روشنی؟''

ایس پی امداد علی شاہ نے سوالیہ نگاہوں سے تھانے دار کو دیکھا، پھر بولا، ''اگر یہ کسی بھوت ووت کا چکر نہیں تو پھر اس گھر میں یقیناً ابھی کچھ لوگ رہ رہے ہیں۔ تم لوگوں نے انھیں بتایا نہیں کہ کسی وقت بھی برابر والی نہر کا پشتہ ٹوٹ سکتا ہے، پھر جو کچھ بچ گیا ہے، وہ سب بھی بہہ جائے گا۔''

تھانے دار نے کہا، ''سب کو بتا دیا گیا تھا سرکار مگر...'' پھر وہ ایس پی کی طرف جھکا اور رازداری سے بولا، ''اصل میں یہ کسبی محلہ ہے سرکار — ناچنے گانے والیاں رہتی ہیں یہاں۔ چھ سات مکانات ان کے ہیں۔ جب سیلاب کا پانی شہر میں گھسا تو اور لوگوں کے ساتھ میں نے خود کسبیوں اور ان کے کارندوں اور سازندوں کو اپنے سامان سمیت یہاں سے جاتے دیکھا تھا تانگوں اور موٹر گاڑیوں میں — مگر اب یہ اچانک...''

وڈیرے دودا خان کا کارندہ آگے والی گاڑی سے اترا اور اندھیرے مکان کی طرف بڑھا۔ گلی کے آخر میں مکان کا زینہ تھا۔ مٹھل نے زینے کا دروازہ دکھایا تو تھانے دار محمد بچل اور ایس پی امداد علی شاہ دیوار ٹٹولتے ہوئے پتلے سے زینے سے اوپر والے دروازے تک جا پہنچے۔ دروازہ بند تھا مگر اندر سے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

تھانے دار محمد بچل نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر تک جواب نہیں آیا۔ پھر کسی نے زور سے پوچھا، ''کون ہے؟''

''دروازہ کھولو۔'' تھانے دار نے ڈپٹ کر کہا، ''ہم تھانے سے آئے ہیں۔''

فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ایک موٹی سی بنی ٹھنی عورت نے باہر جھانکا۔ پھر وہ لہک کے بولی، ''آیئے آیئے سرکار! ہمارے تو نصیب کھل گئے۔ اس مصیبت میں ہمارا خیال تو آیا آپ کو!''

تھانے دار محمد بچل اور ایس پی امداد علی شاہ اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں گیس کا ہنڈا جل رہا تھا جس کی روشنی میں قالین پر محفل جمی تھی۔ دو چار لوگ بیٹھے تھے اور سامنے ایک خوش شکل جوان عورت ہارمونیم اور ڈھولک کی ملی جلی دھن پر گانا گا رہی تھی اور اس کے برابر میں ایک اور کم عمر عورت ناچ رہی تھی۔ پولیس والے اندر آئے تو گانا تھم گیا اور ناچنے والی عورت سہم کے پیچھے ہٹ گئی۔

''آیئے، تشریف رکھیے سرکار!'' موٹی عورت اپنی سرخ اوڑھنی کو اس طرح ادب سے اپنے سر پر کھینچتے ہوئے بولی جیسے اچانک اذان ہونے لگی ہو۔

''ہم بیٹھنے نہیں آئے۔'' ایس پی امداد علی شاہ نے کہا، ''تم لوگوں کو پتا ہے پانی

شہر میں آ گیا ہے، سب چلے گئے مگر خطرے کے اعلان کے باوجود تم لوگ اب تک ڈٹے ہوئے ہو۔ برابر والی نہر کے پشتے میں رساؤ بڑھ گیا ہے۔ اگر پانی ادھر آ گیا تو گانا بجانا سب دھرا رہ جائے گا۔ لگتا ہے تمھیں اپنی جان پیاری نہیں!''

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اچانک ناچنے والی کے سامنے بیٹھے ایک کمبل پوش نے کمبل سے منہ نکال کے بڑے چاؤ سے کہا، ''اسے نہ ہوگی مگر ہمیں تو بہت پیاری ہے، اس کی جان—'' اس کی نشے میں لڑکھڑاتی زبان سے سارے لفظ مشکل سے ادا ہوئے۔

موٹی عورت نے معذرت کرتے ہوئے کہا، ''ان کی بات کا برا نہ مانیں سرکار— یہ ہماری چھمیا کا گانا سننے بالاناغہ یہاں آتے ہیں اپنے گوٹھ سے۔''

تھانے دار نے کہا، ''تمھیں پتا نہیں شہر کی کیا حالت ہے، پانی ہی پانی ہے ہر طرف اور کچھ پتا نہیں کل کیا ہوگا— بہتر ہے کہ تم لوگ بھی اپنا بوریا بستر سمیٹو اور...''

''مگر سرکار!'' عورت بولی، ''ہم لوگ جائیں کہاں؟''

''وہیں جہاں دوسرے گئے ہیں۔'' ایس پی امداد علی شاہ نے مشورہ دیا، ''بہت سی محفوظ جگہیں ہیں۔''

''مجھے پتا ہے سرکار!'' موٹی عورت بولی، ''اچھی بائی، نوراں آپا اور پری خانم نے وقتی طور پر کسی اور جگہ ڈیرہ جمایا ہے مگر سرکار بری حالت ہے ان کی۔ کل ہی میرا ایک آدمی اُدھر سے آیا ہے۔ کوئی امداد نہ کوئی دھندا، بھوکے مر رہے ہیں بے چارے۔''

''اچھا؟'' ایس پی امداد علی شاہ نے کہا، ''پانی میں ڈوب کے مرنا تمھیں منظور ہے، بھوکا مرنا نہیں۔ خیر اب بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ سرکار کی ہدایت پر عمل کرو اور آدھی رات سے پہلے یہاں سے نکل پڑو۔ ہمارے پاس امدادی گاڑیاں موجود ہیں، تمھارا سارا ٹبر اٹھا کے محفوظ جگہ پہنچا دیں گے۔ اطلاع کے مطابق سیلابی پانی کا بہت بڑا ریلا آج آدھی رات کے بعد ادھر سے گزرنے والا ہے، نہر کے پشتے کا بھی کچھ بھروسا نہیں۔ بعد میں پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملے گا، اس لیے کسی محفوظ جگہ...''

وڈیرے دودا خان کا کارندہ مٹھل بھی پیچھے کھڑا ایس پی امداد علی شاہ کی بات سن رہا تھا، وہ آگے بڑھ کے بولا، ''سرکار، وڈیرے کی بارہ دری بھی تو...''

''ہاں۔'' تھانے دار محمد بچل نے کہا، ''وہاں بھی بہت اچھا انتظام ہے۔''

کمبل پوش نے اچانک ایک بار پھر کمبل میں سے اپنا منہ باہر نکالا اور بولا، ''وڈیرے کے یہاں کیوں؟''

وڈیرے کے آدمی نے کہا، ''ادا ان عورتوں پر رحم کرو۔ وڈیرے نے ان پر ترس کھا کے امدادی کیمپ کھول دیا ہے۔ انھیں وہاں جانے دو۔''

کمبل پوش بھڑ گیا، ''کہیں نہیں جائیں گی یہ عورتیں۔ یہ موٹی ماسی چندا بائی اور اس کی ناچنے گانے والی پھلجھڑی خانم اور چھمیا جان بڑی بہادر عورتیں ہیں جو مصیبت کے باوجود اپنے اڈّے پر ڈٹی ہوئی ہیں۔''

ایک شخص اپنے سامنے تاش کے پتے پھیلائے بیٹھا تھا، بولا، ''میں نے فال نکالی ہے ابھی، یہ دیکھو، پان کی ملکہ، اینٹ کی ملکہ اور حکم کی ملکہ— یہ سب جیتی ہوئی عورتیں ہیں— سب دریا سائیں سے ہار گئے مگر یہ عورتیں— میں انھیں سلام کرتا ہوں۔'' اس نے لڑکھڑاتے ہوئے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر پھر دھپ سے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

ایس پی امداد علی شاہ نے پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کی، ''سنو! وڈیرے کی بارہ دری میں جو امدادی کیمپ کھولا گیا ہے، اس میں سرکار کی طرف سے امدادی سامان بھی آئے گا۔ موٹی عورت نے مسکرا کے کہا، ''چھوڑیں صاحب جی! میری مانیں تو آپ بھی جوتے اتار کے ذرا دم لیں— پانی وانی سے کیا ڈرنا!''

تھانے دار محمد بچل نے بگڑ کے کہا، ''لگتا ہے تجھے زندگی سے پیار نہیں۔''

''واہ تھانے دار جی!'' موٹی عورت ٹھنک کے بولی، ''بس جینا ہی تو اچھا لگتا ہے اسی لیے تو یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔''

''وڈیرے کی بارہ دری میں بھی نہیں؟'' تھانے دار نے کہا، ''بڑا اچھا امدادی کیمپ کھولا ہے اس نے تم لوگوں کے لیے۔''

''کیا؟'' موٹی عورت چڑ گئی، ''کیسا امدادی کیمپ؟ مجھے کیا ضرورت ہے وڈیرے کے امدادی کیمپ میں جانے کی؟''

''کیوں، تجھے کیوں ضرورت نہیں؟'' تھانے دار محمد بچل نے تعجب سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں نے تو خود یہاں...'' موٹی عورت بولی، ''وہ سب تو چلی گئیں — میں رہ گئی ہوں اپنی لڑکیوں کے ساتھ۔ میں چلی جاؤں گی تو ان بچاروں کا کیا بنے گا۔ یہ غریب لوگ جو دور دور سے دریا پھلانگتے یہاں سکون کا سانس لینے آتے ہیں۔ کھوسا گوٹھ کا یہ کمبل پوش ٹریکٹر مکینک، بھریا روڈ کا ٹھیکے دار، ٹنڈو خیر محمد کا رکشے والا۔ ان سب کے گھر پانی میں ہیں۔ میں نے یہ امدادی کیمپ ان ہی کے لیے تو کھولا ہے۔ وڈیرے کو میرا اسلام کہیں جی اور انھیں بولیں کہ وہ خود یہاں آنا چاہیں تو خوش آمدید، ورنہ دوسروں کو ادھر بھیجیں۔ ہم سب کی خدمت کریں گے۔''

موٹی عورت نے یہ کہہ کے تھانے دار کو آنکھ ماری اور پلٹ کے گانے والی کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ڈھولک کی تھاپ پر گانا شروع ہوگیا اور ناچنے والی لڑکی جھک کے اپنے پاؤں کے گھنگھرو ٹھیک کرنے لگی۔ بستی کے باہر دریا اپنے کناروں سے اچھل اچھل کے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

زندہ بستی

قبرستان میں کہرام مچ گیا۔ دریا الف ہوگیا تھا اور اس کی بپھری ہوئی موجیں آس پاس کے علاقوں کو تہس نہس کر رہی تھیں۔ شہرِ خموشاں کے مکینوں کو ڈر تھا کہ کہیں وہ بھی اس آسمانی آفت کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس وقت پیر بڑے شاہ کے ہرے سنگِ مرمر کے مزار کے احاطے میں مُردوں کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہو رہا تھا جس میں اس مصیبت سے نمٹنے کے طریقوں پر غور کیا جا رہا تھا۔

پیر صاحب نے جو صاحبِ کرامت بزرگ تھے، اپنے سبز کفن میں سے ہاتھ باہر نکالا اور اپنے عقیدت مندوں کی ڈھارس بندھاتے ہوئے بولے، ''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دریا ادھر کا رخ نہیں کرے گا کیوں کہ ایک تو قبرستان اونچائی پر واقع ہے، دوسرے اس کی راہ میں بہت سی بستیاں بھی آتی ہیں اور وڈیرے زمان خان کے کھیت بچانے کے لیے حفاظتی پشتے مضبوط سے مضبوط تر بنا دیے گئے ہیں۔ پشتوں پر مٹی ڈالی جا رہی ہے اور پتھروں کی فصیل اونچی کی جا رہی ہے۔ رات دن کام جاری ہے۔''

''ہاں بستیاں یقیناً محفوظ ہیں۔'' ایک مردہ بولا، ''مگر قبرستان کو شدید خطرہ ہے کیوں کہ کوئی بھی اسے بچانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگر دریا کے برابر والی سوکھی نہر بھی چل پڑی تو پھر قبرستان کی خیر نہیں۔''

دوسرے مردے نے زور کی جھرجھری لی، ''بھئی مجھے پانی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ میں ڈوب کے مرا تھا، اب مر کے ڈوبنا نہیں چاہتا۔''

ایک بزرگوار اپنی قبر کے کتبے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ تشویش سے بولے، ''ایک بار قبروں میں پانی بھر گیا تو بہت دنوں تک ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ ویسے ہی لوگ کب اپنے مُردوں کو یاد رکھتے ہیں۔ ذرا میرے فرزند کو دیکھیے، پانچ سال پہلے میری قبر پر اگربتی سلگا کے گیا تھا۔ اب تک واپس نہیں آیا، اللہ اسے سیلاب سے بچائے۔''

ایک اور مردہ بیزاری سے بولا، ''اور ذرا میری قبر ملاحظہ ہو، آدھی تو پہلے سے دھنسی ہوئی ہے، بارشوں میں اس کی شکل قدمچے جیسی ہوگئی۔ اگر اب کے پانی اِدھر آیا تو بندہ قبر سے نکل کے سامنے والے پیپل کے پیڑ پر بسیرا کرنے پر مجبور ہوگا۔''

اسی وقت کئی مُردے اپنے کفن میں الجھتے، گرتے پڑتے اندر داخل ہوئے۔ وہ بڑے گھبرائے ہوئے تھے۔ ''کیا بات ہے؟'' پیر صاحب نے سوال کیا۔

''کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟'' کئی اور مردے بھی جو قبروں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، گھبرا کے کھڑے ہوگئے۔

باہر سے آنے والے مُردے بولے، ''ابھی ہم نے کچھ لوگوں کو قبرستان کے پاس سے گزرتے ہوئے یہ کہتے سنا کہ بند بس ٹوٹنے ہی والا ہے، اگر ایسا ہوا تو دریا پوری طاقت سے حملہ کرے گا۔''

پیر صاحب نے کہا، ''اگر یہ بات ہے تو پھر اچھا یہی ہوگا کہ ہم سب محفوظ مقامات کی تلاش میں بستیوں کی طرف چل پڑیں۔ بستیاں تو یقیناً محفوظ ہوں گی، ان کا اتنا خیال رکھا جا رہا ہے۔ دریا کی راہ میں سنگی رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں۔'' سب مردوں نے پیر صاحب کی بات مان لی اور وہ گروہوں کی شکل میں قبرستان چھوڑ کے قریبی بستیوں کی طرف چلے۔

دریا کے حفاظتی بند پر دیوہیکل مشینیں کام کر رہی تھیں اور دریا کو پتھر کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

مگر جب مردے ایک قریبی بستی میں داخل ہوئے تو وہاں دہشت پھیلی ہوئی تھی اور لوگ سروں پر اپنا سامان لادے گھروں سے باہر نکل رہے تھے۔ کچے پکے راستوں پر بیل گاڑیوں، سائیکلوں اور ریڑھیوں کی قطاریں تھیں جن پر مال و اسباب لدا ہوا تھا۔ کپڑوں کے گٹھڑ، بستر، فوم کے گدّے، چارپائیاں، جست کے بکس اور برتن— بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو بھی ساتھ لے جا رہے تھے— گائیں بھینیں، بھیڑیں اور بکریاں— ایک آدمی سر پر مرغیوں کا ٹوکرا لادے ننگے پاؤں بھاگا جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے بچوں کو اپنے کندھوں پر بٹھا رکھا تھا۔ کچھ عورتیں برقعوں میں اور کچھ بے برقع لپکتی جھپکتی جا رہی تھیں۔

کسی نے آگے بڑھ کے ایک کسان کو روکا جو اپنے بیل کو ایسے گھسیٹ کے لے جا رہا تھا جیسے ابھی ذبح کرے گا۔

''کیوں بھاگ رہے ہو تم لوگ بستی سے؟''

''پانی آ رہا ہے۔'' وہ بولا، ''بستی کو خالی کرنے کا حکم آ گیا ہے۔''

''حکم— کیسا حکم؟ ابھی تو بستی محفوظ ہے بھائی، کہاں ہے پانی؟''

''ابھی آئے گا ابھی، بہت تیزی سے۔'' کسان بولا، ''جلدی سے نکل جاؤ تم بھی یہاں سے، ورنہ ڈوب جاؤ گے۔ دریا سمندر ہو گیا ہے؟'' وہ اپنے بیل کو گھسیٹتا ہوا آگے چلا گیا۔

ابھی مردے بستی کے درمیانی چوک تک پہنچے تھے کہ ہر طرف سے دریا کی تیز لہریں گھروں پر دستک دینے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب گلیوں میں پانی گھس آیا اور مکانوں کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مردے تیزی سے واپس پلٹے کیوں کہ بستی میں اب ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔

مردے ایک اور قریبی بستی کی طرف سے گزرے مگر وہاں بھی دریا اپنی عمل داری قائم کر چکا تھا اور پانی نے سب راستے بند کر دیے تھے۔ آس پاس کی کئی بستیوں کا چکر لگا کے مردے حفاظتی بند کی طرف واپس لوٹے مگر دریائی پشتے تک پہنچتے پہنچتے پتا چلا کہ حفاظتی بند میں بھی بڑا سا شگاف پڑ چکا تھا اور بہت سارے لوگ وہاں کھڑے اپنی دیوہیکل مشینیں

دریائی اژدھے کو نگلتے دیکھ رہے تھے۔

اسی وقت ایک جواں مرد نے تیر کے پشتے کے اوپر جانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا، ''بند کیسے ٹوٹ گیا، اسے تو محفوظ بتایا جا رہا تھا؟''

ایک اور آدمی جو اپنی بھینس کے گلے سے چمٹا ہوا پانی کے تیز دھارے میں ڈوبتا ابھرتا بہتا جا رہا تھا، چیخ کے بولا، ''بند ٹوٹا نہیں، اسے توڑا گیا ہے!''

''کس نے توڑا ہے بند؟'' کسی نے سوال کیا۔

''وڈیرے زمان خاں کے آدمیوں نے اور کس نے۔'' جواب آیا۔

''مگر اس سے تو کئی بستیاں ڈوب گئی ہیں۔'' ایک بوڑھی عورت نے کہا جو اپنے گھر کے اکھڑے ہوئے لکڑی کے ایک دروازے پر بہتی ہوئی جا رہی تھی۔

''مگر وڈیرے کے کھیت تو بچ گئے ہیں۔'' کسی نے زور کی ہانک لگائی جو فوراً ہی بہتے پانی کی گڑگڑاہٹ میں ڈوب گئی۔

''بچ گئے ہیں یا بچا لیے گئے ہیں۔'' پھر کوئی بولا۔ جواب میں صرف دریا کا شور سنائی دیا۔

قبرستان سے پناہ کی تلاش میں نکلے ہوئے مردے، زندوں کی ایک بستی سے نکل کے دوسری بستی میں جاتے رہے مگر سب ہی بستیاں ڈوب رہی تھیں اور پانی گھروں کی چھتوں تک پہنچ گیا تھا۔

لوگ اس طرح جان بچا کے بھاگے تھے کہ ان کے بچے بچھڑ گئے تھے، جانور کھو گئے تھے اور گھر کا سامان برباد ہوگیا تھا۔ اونچے اونچے پیڑوں کی چوٹیاں دریا کی سطح سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے پانی میں ہرا گوبھی کا کھیت اُگ آیا ہو۔

بستیوں میں دریا کی یلغار دیکھ کے مردوں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ پیر بڑے شاہ کی سواری سب سے آگے تھی۔ پیچھے پیچھے ان کے عقیدت مند، پڑوسی اور دوست تھے۔

سیلابی پانی کے پھیلے ہوئے سمندر کو عبور کر کے وہ لوگ جب قبرستان میں داخل ہوئے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ قبرستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ سب قبریں صحیح

سالم تھیں اور سیلابی پانی اس کے قریب سے گزر گیا تھا۔

مگر جب پیر بڑے شاہ اپنے مزار تک پہنچے تو دیکھا، وہاں بستی کے لوگوں نے اپنا ڈیرہ جما رکھا ہے۔ پورا قبرستان زندہ لوگوں سے آباد ہوگیا تھا۔ ہر طرف چٹائیاں اور چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کچھ عورتیں چولھے پر بچوں کے لیے روٹیاں پکا رہی تھیں۔

ایک مردے نے ایک شخص کی چارپائی پھلانگ کے اپنی قبر تک پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ شخص تو اسے نہ دیکھ سکا مگر اس کا خوں خوار کتا جو قریب ہی بیٹھا اونگھ رہا تھا، اچانک زور سے بھونکا اور پھر لوگوں نے اسے کسی اَن دیکھی چیز کا پیچھا کرتے دیکھا۔

جہاں جہاں موقع ملا، مردے اپنی قبروں میں چھپ گئے مگر بہت سی قبروں پر لوگوں نے اپنی چارپائیاں بچھا رکھی تھیں۔ کچھ لوگ بعض پختہ قبروں کو بستر کے برابر والی میز کے طور پر استعمال کر رہے تھے جن پر کٹورے، معجون کی ڈبیاں اور چائے کے پیالے رکھے ہوئے تھے۔

دوسرا دن نکلنے تک سیلاب زدگان کی امداد کے لیے آنے والی رضا کاروں کی بہت سی ٹیمیں بھی قبرستان میں پھیل گئی تھیں اور انھوں نے پناہ گزینوں میں خوراک، دوائیں اور کپڑے بانٹنے کے لیے اپنے امدادی کیمپ لگا دیے۔ ہر طرف پانی سے گھرا ہوا قبرستان اچانک جاگ اٹھا اور وہاں دیکھتے ہی دیکھتے بڑی چہل پہل ہوگئی۔ دیگیں کھڑکنے لگیں اور لوگ کھانا تقسیم کرنے والے کارکنوں پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن کھانا تھوڑا تھا اور کھانے والے بہت تھے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ کوئی بڑا یا بچہ چاولوں کی پلیٹ برابر والی قبر پر رکھ دیتا اور پلٹ کے دیکھتا تو وہ غائب ہوتی۔ لوگ ایک دوسرے سے جھگڑتے مگر تھوڑی دیر بعد وہ پلیٹ پھر وہیں رکھی ہوئی نظر آتی۔

ایک بوڑھا چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے بولا، ''میں اپنی بیل گاڑی پر سبزیاں لادے روز اس قبرستان کے پاس سے گزرتا تھا مگر یہ کیا پتا تھا کہ ایک دن اپنا گھر بار چھوڑ کے یہاں پناہ لینی پڑے گی۔ اب پتا چلا کہ قبرستان زندوں کو بھی پناہ دے سکتے ہیں۔ دیکھو کب تک یہاں رہنا ہوتا ہے!''

قریب بیٹھا ہوا آدمی ہنسا، ’’قبرستان کی پناہ تو ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے میرے بھائی، یہاں سے کہیں اور جانے کا خوف نہیں ہوتا۔‘‘

بوڑھا ہنسا، ’’بات تو تم ٹھیک کہتے ہو، دریا ہمیں بھی یہاں لے آیا ہے — تم بھی کسی قریبی بستی سے آئے ہو کیا؟‘‘

’’میں؟‘‘ وہ ہنسا، ’’نہیں میں تو...!‘‘ پھر وہ اٹھا اور چلتا ہوا ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے غائب ہوگیا۔

ایک جوان عورت کو جس کا پانچ سالہ بیٹا کچھ دن پہلے ٹائیفائیڈ سے مر گیا تھا، وہاں اسی کی عمر کا ایک بچہ بہت پیارا لگا۔ وہ ناگ پھنی کے ایک پودے کے پاس کھڑا اسے معصومیت سے تکتا رہتا۔ وہ اسے ترچھی چارپائی کے نیچے اپنی چھوٹی سی پناہ گاہ میں آنے کو کہتی مگر وہ بچہ دور کھڑا مسکراتا رہتا۔ پھر جب وہ اسے پکڑنے کو آگے بڑھتی تو وہ کسی خرگوش کی طرح پھدک کے اس طرف دوڑ جاتا جس طرف پناہ گزینوں کے بوسیدہ ٹرنکوں کا ڈھیر لگا تھا اور کھڑی چارپائیوں پر چٹائیوں کے سائبان تنے ہوئے تھے۔ وہ اس کا پیچھا کرتی مگر قبروں اور کتبوں کی قطاریں اس کا راستہ روک لیتیں۔ لڑکا چھلاوے کی طرح قبروں کے پیچھے غائب ہوجاتا۔

پناہ گزینوں کے بچوں کو یہاں بہت مزہ آرہا تھا۔ وہ ہر وقت اِدھر اُدھر کھیلتے نظر آتے۔ کہیں گلی ڈنڈا چل رہا ہے تو کہیں بچوں کے لیے قبریں گھوڑوں کا کام کر رہی ہیں۔ قبریں ہر طرح ان کے کام آرہی تھیں۔

ایک روز سیلابی پانی میں ایک عورت کی لاش تیرتی ہوئی آئی اور اسے وہیں دفن کردیا گیا۔ دو بچے جو پیٹ کی خرابی کا شکار تھے اور ایک نوجوان جسے شدید بخار ہوگیا تھا، دو تین دن بیمار رہنے کے بعد چل بسے اور قبرستان میں کچھ نئی قبروں کا اضافہ ہوگیا۔

سیلاب زدگان کے قبرستان میں آنے سے وہاں اسی قدر چہل پہل ہوگئی تھی کہ پیر بڑے شاہ کے مزار پر جب اگلی جمعرات کو ان کے مریدوں کی روحیں ایک بار پھر سلام کے لیے جمع ہوئیں تو کئی مردوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ پناہ گزینوں کی آمد

سے اس قدر شور وغل مچ گیا تھا کہ قبرستان اب قبرستان نہیں لگتا۔

پیر صاحب مسکرائے اور بولے، ''لوگ خوامخواہ قبرستان آنے سے ڈرتے ہیں، حالاں کہ سب بستیاں مر جاتی ہیں، صرف یہی ایک بستی ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے، بھئی مجھے تو یہ رونق پسند آ رہی ہے!''

ایک بزرگوار نے کہا، ''سچی بات یہ ہے کہ اِدھر اُدھر قبروں پر چھوٹے بچوں کو چھلانگیں مارتے دیکھ کر مجھے بھی اپنے نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں یاد آتے ہیں۔ بڑا اچھا لگتا ہے۔''

سارے پناہ گزین بھی اپنی زندگی سے مطمئن تھے، یہاں تک کہ جب ایک دن سرکاری کارندوں کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا کہ انھیں قبرستان سے ہٹا کے ان امدادی کیمپوں میں منتقل کیا جائے گا جو دریائی پشتے پر لگائے گئے تھے، لوگوں نے وہاں جانے سے انکار کردیا۔ بستیوں سے خبر آئی تھی کہ وہاں چوروں نے گھروں کا صفایا کردیا تھا۔ جانور بہہ چکے تھے، کھیتوں میں پانی تھا اور گھر خالی— لوگوں کو یہ جگہ وڈیرے زمان خاں کے علاقے سے زیادہ محفوظ لگی۔ ویسے بھی کہیں اور جانا بے کار تھا۔ بہت سے بچے اور بوڑھے بیمار تھے اور لوگوں کو فکر تھی کہ کچھ دنوں میں انھیں پھر یہیں لانا پڑے گا۔ سب نے یہی فیصلہ کیا کہ بستی وہی اچھی ہوتی ہے جہاں سے کہیں اور جانا نہ پڑے۔ تب سے سارے لوگ یہاں مل جل کے رہ رہے ہیں اور بالکل پتا نہیں چلتا کہ قبرستان کے اصل باسی کون سے ہیں۔ زندہ بھی مردہ لگتے ہیں۔ بے شک یہ ایک زندہ بستی کی کہانی ہے۔

اللہ وسایا واٹر ورکس

کیکر کے درختوں کے پیچھے جھلسی ہوئی مٹی کے ٹیلوں کے عقب سے اچانک پانی لانے والی گدھا گاڑی کسی غیر متوقع خوش خبری کی طرح نمودار ہوئی اور گیس فیلڈ کے خاردار تاروں کی باڑ میں موجود پھاٹک سے گزر کے حفاظتی عملے کے کیبن کے سامنے رُک گئی۔

بلوچی سنتری غلام حسین مری لپک کے کیبن سے باہر نکلا اور یہ دیکھ کے حیران رہ گیا کہ گدھا گاڑی میں اللہ وسایا کے بجائے ایک خوش شکل لڑکی سوار تھی۔

''پانی لائی ہوں ادا—'' وہ بولی تو فضا میں سریلا سا گیت بکھر گیا۔

''تم لائی ہو پانی؟'' غلام حسین نے حیرت سے پوچھا، ''ادا اللہ وسایا کدھر ہے آج؟''

''اسے زور کا تپ جو چڑھا ہے— میں اس کی بیٹی ہوں مختاراں— پانی اتار لو مجھے جلدی جانا ہے، شاید آندھی کے آثار ہیں۔'' اس نے تشویش سے آسمان کی طرف دیکھا جو رنگ بدل رہا تھا۔

غلام حسین نے جلدی جلدی پانی بھرے پلاسٹک کے نیلے ڈرم گدھا گاڑی سے اتارے اور کیبن کی طرف منہ کر کے ساتھیوں کو پکارنے لگا۔ دو تین آدمی باہر آئے اور پانی اٹھا کے رہائشی عملے کی قیام گاہ کی طرف لے گئے۔

سنتری غلام حسین نے ٹوپی جھاڑ کے سر پر رکھی اور پلٹ کے پھاٹک کی طرف دیکھا جہاں سے مختاراں کی گدھا گاڑی دھول اڑاتی تیزی سے باہر جا رہی تھی۔

اللہ وسایا گیس فیلڈ کے کیمپ میں پہاڑی چشمے کا پانی پہنچاتا تھا جو پینے کے کام آتا تھا کیوں کہ گیس فیلڈ کے ٹیوب ویل سے کھارا پانی نکلتا تھا۔

یہ گیس فیلڈ بستیوں سے دور ویرانے میں ایسی جگہ واقع تھی جہاں صرف کمپنی کی گاڑیاں ہفتے میں ایک بار کھانے پینے اور استعمال کی دوسری چیزیں پہنچانے آتی تھیں۔ انجینئروں اور بڑے افسروں کے لیے کمپنی کی طرف سے پینے کا پانی بڑی بوتلوں میں شہر سے آتا تھا مگر دیگر ملازمین کے لیے چشمے کا پانی منگایا جاتا تھا اور یہ کام اللہ وسایا کے سپرد تھا جو پہاڑی چشموں سے پانی بھر کے گیس فیلڈ تک پہنچاتا۔

کمپنی کے خوش دل نوجوانوں نے جو اس ویرانے میں تنہا رہنے پر مجبور تھے، پانی کی سپلائی کے اس نظام کو اللہ وسایا واٹر ورکس کا نام دیا تھا۔

گیس فیلڈ کے رہائشی کیمپ میں زندگی نہایت تکلیف دہ اور اکتا دینے والی تھی۔ آہنی پائپوں اور بلند و بالا تکونے فولادی ڈھانچوں کے پھیلے ہوئے جال کے بیچوں بیچ لکڑی، لوہے اور ایلومینیم سے بنے ہوئے ریل کے ڈبوں جیسے عارضی گھروں میں کمپنی کے ملازمین برسوں سے رہ رہے تھے۔

آس پاس بے آب و گیاہ بھوری پہاڑیوں اور جھلسی ہوئی سیاہ مٹی کے ٹیلوں کے سلسلے تھے جن کے اوپر ناگ پھنی کے کانٹے دار پودوں کی بہتات تھی اور جنگلی گھاس نے ڈیرہ جما رکھا تھا۔ دن میں سورج پوری آب و تاب سے چمکتا تھا اور دھوپ کی حدت سے زمین جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھی۔

سنتری غلام حسین نے صبح اٹھ کے اپنے کوارٹر کے باہر کھڑے ہوکر مسواک کرتے ہوئے سامنے دیکھا تو دور تک صحرا میں راکھ کی چادر بچھی نظر آئی۔ کہیں ہریالی کا نام و نشان نہ تھا۔ بادل کبھی کبھار ہی ادھر سے گزرتے تھے۔ اور دریا یہاں سے بہت دور تھا۔ بس اس کی ایک ذیلی نہر جمعہ خان گوٹھ کے پاس سے گزرتی تھی جو سب سے قریب

واقع تھا۔ سنتری غلام حسین ماحول کی اس یکسانیت اور اپنے اندر پھیلے تنہائی اور اداسی کے صحرا سے بیزار ہو کے اپنے دوست فورمین عبدالنبی سے کہتا، ''لگتا ہے کہ ہم چاند کی دنیا میں رہ رہے ہیں یار— بس مٹی ہی مٹی، کہیں کوئی پھول، کوئی سبزہ، کوئی تالاب تک نہیں۔''

فورمین عبدالنبی ادھیڑ عمر کا شادی شدہ شخص تھا جو اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے عرصے سے ویرانوں میں رہنے کا عادی تھا۔ سال میں ایک بار دو مہینوں کے لیے بچوں کے پاس چلا جاتا، پھر واپس آ کے انھیں یاد بھی نہ کرتا۔ اسے پتا تھا ویرانے میں زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

''اگر خوش رہنا ہے تو ناگ پھنی بن کے رہو۔'' وہ سنتری غلام حسین، ڈرائیور، عبدالقدوس اور ٹیکنیشین محمد بخش کو مشورہ دیتا۔ یہ سارے نوجوان تھے اور کنوارے، اور گیس فیلڈ کے رہائشی کیمپ میں بڑی بے لطفی کے دن گزار رہے تھے۔

''ناگ پھنی بن کے رہو، کیا مطلب؟'' کوئی کہتا۔ ''ہم ہیں اور کیا— بابا میں اپنی ٹانگ چھوتا ہوں تو ہاتھ میں کانٹے چبھ جاتے ہیں۔'' وہ سب خود کو کیکٹس ہی سمجھتے تھے۔ ''ہم سب ناگ پھنی بن گئے ہیں ادا عبدالنبی!'' سنتری غلام حسین ہنس کے کہتا۔

''ٹھیک ہی تو ہے،'' محمد بخش بھی سر ہلاتا۔ ''پانی بغیر پورا دشت جھلسا پڑا ہے، گلاب کیسے کھلیں گے یہاں؟ دشت کو سیراب کرنے کے لیے دریا چاہیے۔ یہاں بادل تک تو آتے نہیں؟'' مگر آج اچانک بن بادل بارش کا پہلا چھینٹا پڑا تھا۔ نوجوانوں نے یہی محسوس کیا۔

مختاراں کی آمد سے گیس فیلڈ کی بستی میں اچانک موسم بہت سہانا ہو گیا تھا۔

''اللہ وسایا واٹر ورکس کی خیر ہو!'' سنتری غلام حسین بولا، ''کیا زبردست چیز ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ اللہ وسایا کے پاس اتنے میٹھے پانی کا چشمہ ہے۔''

اس دن سے ان سب کی نگاہیں گیس فیلڈ کے پھاٹک پر لگی رہتیں۔ کچھ دنوں بعد انھیں دور سے پھر گدھا گاڑی دھول اڑاتی کیمپ کی طرف آتی دکھائی دی۔ اللہ وسایا واٹر ورکس کا پانی آ رہا ہے۔ یہ خبر آناً فاناً خوش بو کی طرح پورے گیس فیلڈ میں پھیل گئی اور گرم

دلوں اور روشن آنکھوں والے سارے نوجوان کیمپ کے پھاٹک کے پاس پہنچ گئے۔ گدھا گاڑی اندر آئی مگر یہ دیکھ کے ان کے دل بجھ گئے کہ آج اللہ وسایا خود پانی پہنچانے آیا تھا۔ پانی کے ڈرم اتارے گئے اور اللہ وسایا رخصت ہوگیا۔ ناگ پھنی کے پودے دم سادھے دھوپ کی چادر اوڑھے کھڑے رہے۔

سنتری غلام حسین نے اس رات عجیب خواب دیکھا جیسے گیس فیلڈ کے چاروں طرف پھیلے صحرا میں سرخ مخمل کے قالین سجے ہیں جن پر رنگا رنگ گل بوٹے کھلے ہوئے ہیں، پھر اچانک ان کے بیچوں بیچ ایک راستہ نمودار ہوتا ہے جس پر مختاراں اپنی گدھا گاڑی دوڑاتی تیزی سے آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے— کسی شہزادی کی طرح!

صبح ناشتے کی میز پر چائے کے نیلے مگ میں چمچے کی مسلسل ضربوں سے بڑا سریلا آہنگ پیدا کرتے ہوئے اس نے فورمین عبدالنبی سے کہا، ''دیکھنا اب اس ریگستان کے دن پھرنے والے ہیں۔ اس میں پھول کھلیں گے اور ہری بھری گھاس ہر طرف پھیلے گی اور...''

''اور...'' فورمین عبدالنبی نے اپنا مگ منہ سے لگا کے زور سے چائے کی چسکی لی۔ ''ہمیں خوب گھاس چرنے کو ملے گی۔'' وہ ہنسا، ''تجھے پتا نہیں پاگل خانے، صحرا میں سرخ مخمل کے بجائے گدلے پانی کا فرش بچھنے والا ہے، دریا نے بغاوت کردی ہے۔''

''دریا نے بغاوت کردی ہے؟'' سنتری غلام حسین حیران ہوا۔ ''یہاں دریا کہاں؟ ایک بے چاری نہر ہے، وہ بھی میلوں دور— یہاں تک پانی کیسے پہنچے گا؟''

''تجھے کچھ پتا ہی نہیں۔'' فورمین عبدالنبی بولا، ''ذرا خبریں وبریں بھی سنا کر۔ کل کامن روم میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا کہ سیلاب نے دریا کے دونوں کناروں پر تباہی مچا رکھی ہے— نہروں کے پیٹ بھی پھول گئے ہیں۔ اللہ خیر کرے!''

ناشتے کے بعد سنتری غلام حسین گیس فیلڈ کے پھاٹک کے قریب بنے نگہبانوں کے ٹاور پر چڑھ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر دور تک صحرائی دھول میں اٹے ہوئے کیکر کے پیڑوں اور جھلسی ہوئی مٹی کے ٹیلوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ''یہ ادا عبدالغنی بھی نا،

بہت ہی چھوڑو ہے۔'' وہ دل ہی دل میں ہنسا۔ باہر حسبِ توقع تیز دھوپ نے ہر طرف آگ لگا رکھی تھی۔ وہ اوپر سے اتر کے گیٹ کے پاس بنے سنتریوں کے کیبن کے پاس چلا گیا جہاں دن کی ڈیوٹی والے سنتری موجود تھے۔

''سلام غلام حسین!'' نوجوان سنتری گل خان نے اسے دیکھ کے ہاتھ ہلایا۔ ''خیر تو ہے، اس گرمی میں کیوں باہر نکل آئے؟''

سنتری غلام حسین جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ پھاٹک کے باہر ہارن بجا اور کسی ٹرک کے انجن کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ سنتریوں نے پھاٹک کھولا تو کمپنی کا سپلائی ٹرک ہفتے بھر کا کھانے پینے کا سامان، افسروں کے لیے پانی کی بوتلیں اور مشینوں کے پرزے اور اوزار لے کر اندر داخل ہوا۔ بڈھا ٹرک ڈرائیور احمد خان کمپنی کا پرانا ملازم تھا۔ اس نے ٹرک کو سلیٹی رنگ کے لمبے کنٹینروں میں قائم اسٹور کے قریب بنے چبوترے کے ساتھ کھڑا کر دیا اور اسٹور کیپر قلندر خان سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ مزدور ٹرک سے سامان اتارنے لگے تو ٹرک ڈرائیور نے قلندر خان کو سامان کی فہرست تھمائی اور بولا، ''جلدی جلدی سب چیزیں دیکھ لو کیوں کہ مجھے فوراً لوٹنا ہے، سڑک پر پانی آنے کا خطرہ ہے۔''

''پانی؟ کیسا پانی؟'' کسی نے سوال کیا۔

''سیلابی پانی بھئی۔'' احمد خان نے جواب دیا، ''کئی جگہوں پر دریا کے پشتے ٹوٹ گئے ہیں اور جنوبی علاقے میں تو کئی گاؤں بہہ گئے ہیں!''

سنتری غلام حسین نے تشویش سے پوچھا، ''اگر سڑک بند ہوگئی تو شہر سے یہاں سامان کیسے آئے گا؟''

''اس کی فکر مت کرو۔'' ٹرک ڈرائیور احمد خان بولا، ''کمپنی کے پاس اپنے ہیلی کوپٹر ہیں، مگر مجھے تو اپنی فکر ہے۔''

احمد خان اپنا ٹرک لے کر گیس فیلڈ سے ایسے بھاگا جیسے بھوت اس کا پیچھا کر رہے ہوں مگر جب سارے لوگ مغرب کی نماز کے بعد کامن روم میں ٹی وی کے سامنے جمع ہوئے تو خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ گیس فیلڈ کو شہر سے ملانے والی سڑک کو دریا

نے نگل لیا ہے جس کے نتیجے میں بے شمار گاڑیاں پانی میں گھر گئی ہیں جنھیں بحریہ کے جوانوں کی مدد سے وہاں سے نکالا جا رہا ہے۔ احمد خان کو بھی اس کے ٹرک سمیت وہاں سے نکال لیا گیا تھا۔

صبح تک سیلابی ریلا گیس فیلڈ تک پہنچ گیا۔ جمعہ خان گوٹھ کے قریب نہر کی فصیل میں چور دروازہ کھل گیا تھا جس سے پانی کے لشکر نے آگے بڑھ کے پورے صحرا پر قبضہ کر لیا تھا۔

گیس فیلڈ کے منیجر آدھی رات سے ہی احاطے کے باہر ریت کی بوریوں کے پشتے بنوا رہے تھے تاکہ گیس فیلڈ کی تنصیبات کو سیلابی پانی سے بچایا جا سکے۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ گیس فیلڈ بہت سارے ریت کے اونچے ٹیلوں میں گھری ہوئی تھی، اس لیے پانی کی یلغار سے تنصیبات کو اتنا خطرہ نہیں تھا۔

گیس فیلڈ پر کام بھی رک گیا تھا اور کارکن زیادہ وقت کامن روم میں ٹی وی کے سامنے گزارتے رہتے۔ سیلاب کی تباہ کاریوں نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ کچھ لوگ جن کے گاؤں سیلاب سے متاثر ہوئے تھے، چھٹی لے کر ان علاقوں میں جانا چاہتے تھے جہاں ان کے گھر والوں کو امدادی کیمپوں میں منتقل کیا گیا تھا مگر ابھی سب راستے بند تھے۔

ایسے میں کسی کو اللہ وسایا کی یاد آئی جو ہر جمعرات کو گیس فیلڈ کے ملازمین کے لیے پینے کے پانی کے ڈرم پہنچانے آتا تھا۔

''اب بھلا وہ یہاں کیسے آئے گا؟'' سنتری غلام حسین نے کہا، ''پانی نے سب راہیں بند کر دی ہیں! مگر عین اسی وقت جب کیمپ کے سارے مکین، سنتری، کلرک، اسٹور کیپر اور انجینئر پانی کا راستہ روکنے کے لیے مزدوروں کو سامنے والے پھاٹک کے باہر ریت کی بوریوں کی دیوار اونچی کرتے دیکھ رہے تھے، پچھلے پھاٹک سے اللہ وسایا کی گدھا گاڑی بڑی شان سے اندر داخل ہوئی۔ حسبِ معمول اس پر پانی کے نیلے ڈرم لدے ہوئے تھے۔

''ارے تو کدھر سے ٹپک پڑا اللہ وسایا؟'' سنتری غلام حسین نے حیران

ہو کے پوچھا، ''اس طرف تو پانی ہی پانی ہے—'' اس نے سامنے والے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''وری ہم کو کون روک سکتا ہے ادھر آنے سے۔'' اللہ وسایا نے ڈینگ ماری، ''پانی سامنے ہے، پیچھے تو نہیں— ہم جبل کے پیچھے گھوم کے ادھر آیا ہے۔ راستہ تھوڑا لمبا تھا مگر کوئی بات نہیں، ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے نا!''

پانی کے ڈرم اتارنے کے بعد اس نے پھر سب کو زور کا سلام جھاڑا اور بولا، ''اب اگلی جمعرات کو ملاقات ہوگی!''

ہفتے بھر میں سیلابی پانی اتر گیا۔ کہیں کہیں چھوٹے تالاب سے بن گئے اور گیس فیلڈ کے باہر ٹیلوں پر پہلی بار سبزہ اُگنے لگا اور پھول پودے سر اٹھا اٹھا کے حیرت سے آنے والوں کو تکنے لگے۔ پانی نے مٹی کا مزاج بدل دیا تھا۔

مگر جمعرات آئی اور گزر گئی اور اللہ وسایا نہیں آیا۔ پھر اگلے روز جب کامن روم میں سارے لوگ جمع ہوئے تو گیس فیلڈ کے منیجر نے بتایا کہ اسے وائرلیس پر مرکزی دفتر سے پیغام ملا تھا کہ اللہ وسایا فوت ہوگیا ہے۔ وہ دو تین دن پہلے اپنے گاؤں میں پانی آنے کے بعد گھر سے باہر نکل رہا تھا کہ سیلابی ریلے میں بہتے ہوئے ایک سانپ نے اسے ڈس لیا۔ منیجر نے بتایا کہ اللہ وسایا تو مر گیا مگر پانی کی سپلائی کا پرانا انتظام جاری رہے گا۔

اگلی جمعرات کو گیس فیلڈ کے سارے ملازمین مرکزی پھاٹک کے پاس جمع تھے۔ سنتری غلام حسین اور اس کے سارے دوست، فورمین عبدالنبی اور اسٹور کیپر قلندر خان—

''کیسا اچھا لگ رہا ہے خان صاحب!'' سنتری غلام حسین نے قلندر خان کو مخاطب کیا، ''پانی نے ریت میں پھول کھلا دیے ہیں، ناگ پھنی تک ہرے ہوگئے ہیں۔'' اس نے فورمین عبدالنبی کو دیکھا۔

''ہاں۔'' فورمین عبدالنبی نے پوچھا، ''مگر یہ سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں اس وقت؟'' ''پانی کی گاڑی آنے والی ہے نا۔'' سنتری غلام حسین مسکرایا۔

''تو—؟'' فورین عبدالنبی نے جھنجھلا کے اسے دیکھا، ''تمھیں افسوس نہیں کہ اللہ وسایا...!''

''ہاں، ہم سب اسی لیے تو یہاں آئے ہیں۔'' سنتری غلام حسین نے اپنی مسکراہٹ کو مزید معنی خیز بناتے ہوئے جواب دیا، ''غم بٹائیں گے ہم اس کی پیاری بیٹی کا!''

شہر نامہ

پہلے دن میں نے انھیں چڑیا گھر میں سب جانوروں کی تصویریں اتارتے دیکھا۔ دوسرے دن وہ مجھے ایک اسکول کے باہر کھیل میں مگن بچوں کے چہرے اپنے کیمرے میں محفوظ کرتے نظر آئے۔ اور تیسرے دن — خیر اس دن جو کچھ ہوا، وہ تو میں بعد میں بتاؤں گا مگر پہلے میں آپ کے سامنے یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے خبطی شخص سے پہلے کبھی میرا پالا نہیں پڑا تھا۔ خبطی کیا میں تو اسے پاگل ہی کہوں گا۔ مگر صاحب ہمارے ٹیلی وژن چینل کو دیکھیے، وہ موصوف کے بارے میں ایک دستاویزی فلم تیار کرنا چاہتے ہیں اور مجھے یہ ذمے داری سونپی گئی ہے کہ میں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہوں اور بغیر کچھ کہے سنے ان کی کارگزاریوں کی عکس بندی کرتا رہوں۔

یہ چار ہفتوں کا پروجیکٹ تھا جس کی تکمیل کے بعد ایک تقریب میں ان صاحب کے کارناموں کو ان کی کھینچی ہوئی تصویروں، جمع کی ہوئی آوازوں، خبروں اور مضامین کے تراشوں کی شکل میں آنکھوں اور کانوں کی ضیافت کے طور پر پیش کیا جانا تھا۔ موصوف نے اس پورے منصوبے کو 'مستقبل سے معانقہ' کا نام دیا تھا۔ میں شاید اس اکتا دینے والے کام سے بیزار ہو کے پہلے ہی ہفتے وہاں سے بھاگ لیتا مگر ڈاکٹر قنوطی، جی ہاں ان کا نام ہی قنوطی تھا کیوں کہ وہ ہمیشہ ہر چیز کے بارے میں بڑی یاس انگیز اور مایوس کن رائے کا

اظہار کرتے تھے، تو ڈاکٹر قنوطی کی معاون رفیقۂ کار فریحہ نے مجھے اس حرکت سے باز رکھا۔ اس نے کہا، ''ڈاکٹر قنوطی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شہر ایک دن اچانک پانی کے بلبلے کی طرح فنا ہوجائے گا، اس لیے وہ اس کی تمام نشانیوں کو تصویروں، آوازوں اور اخباری تراشوں کی شکل میں آنے والی نسل کے لیے ذخیرہ کر رہے ہیں۔ اس عجائب گھر کا نام انھوں نے ''شہربین'' رکھا ہے۔

فریحہ ''شہربین'' کی افسرِ رابطہ تھی۔ اس کی مسکراہٹ اتنی دل کش اور بات کرنے کا انداز اتنا پیارا تھا کہ میں نے صرف اس کی خاطر پروجیکٹ سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ ترک کردیا اور پھر اگلے چار ہفتوں میں جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے پیش آیا، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

پہلا ہفتہ: عکس در عکس

یہ صرف عکاسی کا ہفتہ تھا جس کے دوران انسانوں، جانوروں اور عمارتوں کی تصویرکشی جاری رہی۔ شہر کے جتنے گنبد و مینار، تعمیراتی شاہکار اور پُرہجوم بازار تھے، وہ ڈاکٹر قنوطی کے کیمرے کی آنکھ میں جذب ہوتے نظر آئے— باتیں کرتے لوگ، کھانستے کھنکارتے موٹر رکشا، کھڑکھڑاتی بسیں، ہنہناتے گھوڑے، ممیاتی بلیاں اور کٹ کٹ کرتی مرغیاں— اسکول بس سے اترتی وہ چھوٹی لڑکی جس کی پونی ٹیل میں تتلی بندھی تھی۔ پانچویں منزل پر رہنے والی عورت جو اپنی بالکونی سے سبزی فروش کے لیے اپنی ٹوکری لٹکا رہی تھی، موٹر سائیکل پر کرتب دکھاتا ہوا محلے کا لڑکا، پان فروش کے کھوکھے پر لٹکتی ہوئی جلتی رسّی سے سگریٹ سلگاتا بے فکرا نوجوان اور گلی کے ایک مکان کے بند دروازے پر دستک دیتا بوڑھا ڈاکیہ جس کے ہاتھ میں ان خطوں کا پلندہ تھا جو ابھی تقسیم نہیں کیے جاسکے تھے۔

فریحہ نے ان ساری تصویروں کو ''شہربین'' کے کمپیوٹر میں ذخیرہ کرتے ہوئے کہا، ''یہ ہیں ہمارے شہر کے گزرے کل کی جھلکیاں!''

اس دن ہماری گاڑی ٹریفک میں پھنس گئی تھی۔ راستے میں بڑا ہجوم تھا۔ پتا چلا

کہ ایک مقبول لیڈر نئے تعمیر شدہ پل کا افتتاح کر رہے تھے۔ وہ پل کے اوپر پھولوں کا ہار پہنے کھڑے نظر آئے۔ ڈاکٹر قنوطی نے انھیں ایک نظر دیکھا اور بولے، ''ان کی بھی تصویر کھینچنا ضروری اور اس پل کی بھی۔''

پھر ایک دن وہ صرف ایک سڑک کی تصویریں کھینچتے رہے— پھر ایک مسجد کی— پھر ایک پارک کی جس میں بچے جھولا جھول رہے تھے۔ ایک دن وہ آرٹس کونسل میں تصویروں کی نمائش دیکھنے گئے۔ ایک نوجوان مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر کے پاس کھڑا تھا۔ تصویر ایک دوشیزہ کی تھی— لمبے لمبے بال، صراحی دار گردن، خوب صورت کان مگر چہرے کے نقوش ناپید تھے۔ وہاں آنکھ تھی، نہ ناک، نہ ہونٹوں کی پنکھڑیاں— ڈاکٹر قنوطی نے پوچھا— ''کیا یہ تمھاری محبوبہ کا چہرہ ہے؟''

''ہوسکتا ہے—!'' مصور بولا۔

''مگر تم نے اسے نامکمل کیوں چھوڑ دیا اسے پورا تو کرونا۔'' ڈاکٹر قنوطی نے کہا۔

''روز بناتا ہوں مگر روز اس کی شکل بدل جاتی ہے، پہچانی نہیں جاتی!'' مصور افسردگی سے بولا۔ ڈاکٹر قنوطی نے مصور اور اس کی تصویر دونوں کو اپنے کیمرے میں محفوظ کرلیا۔ پھر وہ ایک شادی گھر کی عکس گری کرتے نظر آئے۔ ''شادیاں ہوتی رہیں گی، محبتیں ختم ہوجائیں گی۔'' وہ بولے۔

پہلا ہفتہ گزرنے کے بعد ان کی بے معنی سرگرمیوں سے اکتا کے میں نے فریحہ سے کہا، ''ڈاکٹر قنوطی کے ساتھ وقت گزارنا بڑا مشکل ہے۔ ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور خاموشی کے ساتھ ان کی بے تکی حرکتوں کا تماشائی بنے رہنا کچھ پاگل پن سا لگتا ہے۔''

''تم اپنا کام کرتے رہو۔'' فریحہ نے جواب دیا، ''ڈاکٹر صاحب مستقبل شناس ہیں اور ان کا خیال ہے کہ بہت جلد ہمیں نیا شہر بسانے کی ضرورت پڑے گی کیوں کہ یہ شہر دم توڑ رہا ہے۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے یہی سوال خود ڈاکٹر قنوطی سے کیا جو اس وقت شہر کے ایک بڑے قبرستان میں قبروں کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔

انھوں نے میرا سوال سنا اور بولے، ''دیکھو یہ قبرستان کتنی تیزی سے آباد ہو رہا

ہے، ہر طرح کے لوگ تیزی سے ادھر بھاگے چلے آ رہے ہیں— ڈاکٹر، انجینئر، مولوی، سیاسی ورکر— نہ جانے کتنی کھدی ہوئی قبریں اپنے مکینوں کے انتظار میں ہیں۔ شہر نے خودکشی کا بٹن دبا رکھا ہے۔''

میں نے پوچھا، ''شہر فنا ہوتے ہیں سیلابوں اور زلزلوں سے مگر یہاں تو ایسی کوئی آفت نہ آئی، پھر اسے کیا ہوا؟''

کہنے لگے، ''غلط کہتے ہو، تم نے دیکھا نہیں موت کے سفاک ہاتھ گھروں کے دروازوں پر پھولوں سے آراستہ زندگی کی سرسبز بیلیں نوچ رہے ہیں۔''

میں نے کہا، ''مگر شہر کو بچانے کی کوئی صورت تو ہوگی؟''

بولے، ''کیوں نہیں، زندہ لوگ اسے بچا سکتے ہیں، مگر افسوس کوئی زندہ نہیں!''

''کیا؟'' میں حیران ہوگیا۔ ''اور یہ جو اتنے سارے لوگ دن بھر ایک دوسرے سے سر ٹکراتے پھرتے ہیں؟''

''مردے— جو ابھی دفن نہیں کیے گئے۔'' انھوں نے جواب دیا۔

میں نے پھر فریحہ سے شکوہ کیا، ''کمال ہے ڈاکٹر صاحب ہم تم، کسی کو زندہ ہی نہیں سمجھتے۔'' فریحہ ہنسی، ''تو ڈھونڈ لاؤ نا کسی زندہ آدمی کو ان کے لیے۔ میں نے تو بہت کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ وہ کسی کو زندہ کہلانے کے قابل نہیں سمجھتے۔ مجھے، نہ میرے خاوند کو۔''

''تمھارے خاوند کو— وہ کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ مجھے چھوڑ گیا ہے، اولاد جو نہیں— کہتا ہے تم ماں نہیں بن سکیں۔''

دوسرا ہفتہ: آوازوں کے سائے

دوسرا ہفتہ شروع ہوا تو ڈاکٹر قنوطی نے کیمرہ رکھ دیا اور اپنا ٹیپ ریکارڈر سنبھال لیا۔ اب وہ اپنے آواز گھر کے لیے آوازیں جمع کر رہے تھے۔ پرندوں، پھولوں پر منڈلاتے بھونروں اور شہد کی مکھیوں کی، پیڑوں کے سرگوشیاں کرتے پتوں اور ہوا کی سیٹیوں کی اور سڑک پر رگڑ کھاتے ٹائروں کی چیخوں کی—

گھومتے پھرتے میں نے ایک آدمی کو دیکھا جو ایک دوسرے شخص کو پیڑ سے باندھ کے اس کی پٹائی کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ وہاں جمع تھے اور بڑی دل چسپی سے سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

''کیوں مار رہے ہو اسے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ شخص پیڑ کو مُوت کے ناپاک کر رہا تھا، گندہ آدمی۔'' پیٹنے والا بولا۔

میں نے دل میں سوچا، ''اچھا تو شاید یہ ہے زندہ آدمی جس کی مجھے تلاش ہے۔ میں نے اس شخص سے کہا، ''چلو تمھیں اس نیک کام کے لیے انعام دلواتا ہوں۔'' میں دونوں کو ڈاکٹر قنوطی کے پاس لے گیا، ''لیجیے یہ ہے آپ کا مطلوبہ شخص!''

وہ مسکرائے اور ٹیپ ریکارڈر چلا کے بولے، ''زندہ آدمی، کیا تم نے خود اس شخص کو پیڑ کے نیچے پیشاب کرتے دیکھا تھا؟''

اچانک دوسرا شخص گڑگڑایا، ''میں پیشاب تو نہیں کر رہا تھا صاحب!''

''مگر وہ لوگ تو کہہ رہے تھے، اتنے سارے لوگ — محلے کے لڑکے بھی —'' زندہ آدمی بولا۔

''وہ وہاں کرکٹ کھیلنا چاہتے تھے صاحب — انھوں نے میرا خوانچہ بھی الٹ دیا، بھنے چنوں کا — میں تو...'' دوسرا آدمی رونے لگا۔ ڈاکٹر قنوطی کا پارہ چڑھ گیا، ''دیکھا — سب گواہیاں جھوٹی ہوتی ہیں اور مردے مردوں پر ظلم کرتے ہیں۔''

اس کے بعد کئی روز تک ڈاکٹر قنوطی جھوٹے عدالتی گواہوں، جھوٹے شعر گھڑنے والوں، فرضی محبت کے قصے تراشنے والوں اور نقالوں کی آوازوں کو اپنے آواز گھر کے لیے محفوظ کرتے رہے۔

پھر فریحہ نے بھی انھیں ایک کیسٹ لا کے دیا۔ ''اس میں میرے خاوند کی آواز ہے، اس نے مجھ سے فون پر بات کی تھی اور کہا تھا، میں تمھارے بغیر خوش ہوں مگر تم بس اس خیال سے خوش رہو کہ شاید کسی دن میں تمھیں لینے آجاؤں، دنیا میں سب کچھ ممکن ہے، مگر افسوس، تم ماں نہیں بن سکیں!''

ابھی آوازوں کو محفوظ کرنے کا سلسلہ جاری تھا کہ مجھے ایک نیک آدمی نظر آیا جو اسپتال میں خون کا عطیہ دے کر نکل رہا تھا۔ میں اسے ڈاکٹر قنوطی کے پاس لے گیا۔

''سر! اب کی بار میں سچ مچ ایک زندہ آدمی ڈھونڈ لایا ہوں جو دوسروں کو زندہ رہنے میں مدد دیتا ہے اور اپنا خون دینے میں بخل نہیں کرتا۔''

''بہت خوب — '' ڈاکٹر قنوطی نے اس شخص کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اپنا ٹیپ ریکارڈر چلا کے بولے، ''تو تم ضرورت مندوں کو خون کا عطیہ دیتے ہو — شاباش!''

آدمی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کب دیتے ہو؟'' انھوں نے پوچھا۔

''جب ضرورت پڑتی ہے!'' آدمی نے بولا۔

''کسے؟'' کسی مریض، کسی زخمی، کسی مرتے ہوئے شخص کو؟''

''نہیں — خود مجھے۔'' وہ آدمی بولا، ''کچھ پیسے مل جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر قنوطی نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا اور ٹھنڈا سانس بھر کے بولے، ''ٹھیک کہتے ہو، مرنے کے بعد بھی ضرورتیں ختم نہیں ہوتیں۔''

آوازوں کا ہفتہ ختم ہونے کو تھا کہ ایک روز ڈاکٹر قنوطی کے پاس چگی داڑھی والا ایک ٹھگنا سا آدمی آیا جس نے سرمئی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر جالی دار ٹوپی اور پاؤں میں بلوچی چپل۔

''میں آپ سے آخری بار ملنے آیا ہوں سر!'' وہ بولا۔

''کیوں، آخری بار کیوں خدا بخش؟'' ڈاکٹر قنوطی نے پوچھا، ''تم پھر مسقط وسقط جا رہے ہو گیا، یہاں دل نہیں لگا۔ ہاں بھئی جو لوگ اتنے دنوں باہر رہیں پھر ان کا دل یہاں کیسے لگ سکتا ہے۔ حالاں کہ تمھارا کام اچھا تھا، اسکول کے بچوں کی وین چلانا تو بڑا نیک کام ہے — اب مسقط میں دوبارہ ڈرائیوری مل گئی کیا؟''

''نہیں سر! میں مسقط تو نہیں جا رہا۔'' خدا بخش نے جواب دیا، ''آپ کو پتا ہے پچھلے مہینے جب میری اسکول بس کو اغوا کر کے بچوں کو یرغمال بنایا گیا تب سے میرا جی

اچاٹ ہوگیا تھا اس کام سے— مگر میں کہیں باہر نہیں جارہا ہوں۔''

''پھر—؟'' ڈاکٹر قنوطی نے پوچھا، ''کیا کوئی بس چلاؤ گے؟''

''میں ایمبولینس چلاؤں گا سر!'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر قنوطی بولے، ''اب شہر میں بسیں کم ایمبولینسیں زیادہ چلتی ہیں۔''

تیسرا ہفتہ: گم شدہ چہرے

اس ہفتے ڈاکٹر قنوطی ''شہربین'' میں خبروں کے تراشوں اور ان میں لپٹے ہوئے گم شدہ چہروں کے بارے میں نت نئے انکشافات کرتے رہے۔ یہ وہ چہرے تھے جو کھو گئے تھے، انھیں اٹھا لیا گیا تھا یا وہ دھماکوں کی نذر ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر قنوطی ماہرین اور شہری انتظامیہ کے نمائندوں کے ایک پینل کے سامنے نیا شہر بسانے کا نظریہ پیش کر رہے تھے۔

وہ کبھی ایک تصویر اٹھاتے اور کبھی کوئی اخباری تراشہ دکھاتے اور کہتے—

''چہرے مٹ رہے ہیں، آواز گم ہو رہی ہیں۔ جو زندہ تھے، وہ مر چکے اور جو مر چکے ہیں، وہ کنواری قبروں کی تلاش میں ہیں۔ پھر انھوں نے ایک اور تصویر اٹھائی۔ یہ ایک بچے کی تصویر تھی۔ ''شہربین'' کے مردہ خانے میں موجود ایک زندہ تصویر! ایک نوزائیدہ بچے کی تصویر— بچہ ایک جھولے میں لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

ڈاکٹر قنوطی نے کہا، ''اس بچے کو شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی میں کوڑے کے ایک ڈھیر پر پایا گیا تھا۔ ہم نے اب ایدھی سینٹر سے کہا ہے کہ وہ اسے اپنے یہاں لے جائیں!''

ڈاکٹر قنوطی کا انٹرویو ختم ہوگیا۔

چوتھا ہفتہ: ''شہربین''

ڈاکٹر قنوطی کے بارے میں دستاویزی فلم مکمل ہوگئی تھی۔ اس کا نام بھی ''شہربین'' ہی رکھا گیا تھا اور اس میں ان کی ذخیرہ کی ہوئی تصویروں، آوازوں اور تراشیدہ خبروں پر

مشتمل کہانی پیش کی گئی تھی۔ دستاویزی فلم میں ماہرین کے بیانات کے علاوہ ڈاکٹر قنوطی کا وہ انٹرویو بھی شامل کیا گیا تھا جس میں انھوں نے شہر کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ فلم کیا تھی، مرتے ہوئے شہر کا مرثیہ تھی۔

دستاویزی فلم کے اختتام پر تقریب میں موجود تمام مہمانوں نے زبردست تالیاں بجا کے ڈاکٹر قنوطی کو ان کے اس بے مثال کارنامے کی داد دی اور یہ توقع ظاہر کی کہ معاشرے کے بڑے لوگ، لیڈر صاحبان اور منصوبہ بندی کے ماہرین ان کے شان دار تحقیقاتی کام کی روشنی میں ایک نیا شہر بسانے کا بیڑا اٹھائیں گے۔ اس انوکھے کارنامے کے لیے ڈاکٹر قنوطی کے عملے کی کارکردگی کو بھی سراہا گیا۔

جس وقت ڈاکٹر قنوطی حاضرین کا شکریہ ادا کر رہے تھے، میں نے آگے بڑھ کے وہ رقعہ انھیں پیش کیا جو انھیں دینے کے لیے کوئی میرے حوالے کر گیا تھا۔ انھوں نے مڑا ہوا رقعہ لیا اور اسی طرح بغیر پڑھے جیب میں رکھ لیا۔

اس کے بعد انعامی تقریب منعقد ہوئی جس میں ''شہربین'' کے عملے کے ارکان کو جن میں تصویروں اور تراشوں کی لائبریری اور آواز گھر کے کارکنان اور دیگر کارندے شامل تھے، اعزازات سے نوازا گیا۔ سب نے اپنے اپنے انعامات وصول کیے مگر جب فریحہ کا نام پکارا گیا تو وہ موجود نہیں تھی۔

تقریب ختم ہوئی تو مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد ڈاکٹر قنوطی نے جیب سے رقعہ نکال کے پڑھا۔ یہ فریحہ کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا، ''میں جا رہی ہوں سر! اس بچے کو لے کر جو 'شہربین' کے مردہ خانے میں کسی بری خبر کے تراشے کی طرح دفن کر دیا گیا تھا۔ شاید کبھی میرا خاوند آپ کے پاس آئے، مجھے ساتھ لے جانے — اسے بے شک ایدھی مرکز والوں کے حوالے کر دیں ان کے مُردہ خانے کے لیے — افسوس وہ باپ نہیں بن سکا۔''

سخی لوگ

عطیہ مرگئی، جیسے سب مرتے ہیں— مگر ایسے اچانک— میں سکتے میں آ گیا۔
صبح میں نے ای میل کھولا تو خدیجہ کا برقی پیغام آنکھوں میں تیر گیا: ہماری بلکہ ہم سب کی عطیہ آج چل بسی۔ آیئے سب مل کے اسے گزرے کل کے حوالے کریں۔

ارے بھئی بدن تو پھلجھڑی ہوتا ہے، ایئرپورٹ جاتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک عطیہ کا ایک فقرہ آتش بازی کے کسی سنہرے پھول کی طرح کھل اٹھا— اور جب اسے پھلجھڑی کی طرح راکھ ہونا ہے تو کیوں نہ خوشی کے پھول بکھیر کے لوگوں کو آسودگی کے کچھ لمحے فراہم کیے جائیں۔

پھلجھڑی— آگ کے پھول، بدن کے اسرار— عطیہ شعر نہیں کہتی تھی مگر اس کی باتیں شاعروں کو بھی پسند آتیں— اور مجھے پتا تھا اس کی باتوں میں یہ جادوئی اثر احمد سے اس کی دوستی کے بعد ابھرا تھا— اس کی کالی آنکھوں میں ہر وقت گہری سوچ کے پھول کھلے رہتے۔

احمد اور عطیہ دونوں میرے قریب تھے اور میری اہمیت ان کے لیے ایک مشترک لیٹر بکس کی تھی جس میں دونوں طرف کے سندیسے ذخیرہ ہوتے رہتے تھے۔

احمد خوب صورت نوجوان تھا، نہایت جذباتی اور سرکش— زندگی اس کے

لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ سوال اس کے لیے ہمیشہ ناقابلِ فہم رہا کہ زندگی کا مقصد کیا ہے۔

''یہ بے کار، بے مقصد اور بے سمت زندگی— عطیہ! ہمیں اسے اپنی کوششوں سے بامقصد بنانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، پہلے پڑھ لکھ لو، پھر شادی بھی کر لینا۔'' میں اسے نہایت مخلصانہ مشورہ دیتا۔

''شادی کی تمنا کسے ہے برادر—'' وہ غصے سے مجھے گھورتا، ''تمھیں پتا ہے میرے علاقے میں کتنی ناانصافی ہے، کتنا ظلم ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو صاف پانی کو ترس رہے ہیں۔''

''اچھا۔'' میں اسے چھیڑنے کو کہتا، ''تو کیا وہاں لوگ شادیاں نہیں کرتے، بلکہ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ وہاں تو لوگ چار سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔''

''یار شادی کی کون بات کر رہا ہے۔'' احمد مزید خفا ہوتے ہوئے کہتا، ''میں بتا رہا ہوں، وہاں کوئی خوش نہیں ہے، کیوں کہ خوش ہونے کی کوئی بات ہی نہیں وہاں؟''

''تو...'' عطیہ کہتی، ''تمھارے خیال میں تمھارے مٹھیاں جکڑ جکڑ کے تقریریں کرنے سے وہ خوش ہو جائیں گے؟ ان کی زندگی بہتر ہو جائے گی؟ اگر تمھیں کچھ کرنا ہے تو اس کے لیے خود کو تیار کرو۔ جاؤ وہاں تعلیم پھیلاؤ۔ گھر گھر روشنی پہنچاؤ۔ انھیں بتاؤ کہ ان پہاڑوں کے پار کیا ہے۔ پوری دنیا ان کی منتظر ہے۔ ہے کوئی جو یہ ساری کائنات ان کے لیے تسخیر کرے—!''

احمد خلافِ توقع مسکرانے لگا جیسے عطیہ کی بات اسے پسند آئی ہو۔ اس نے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو، میں کروں گا یہ دنیا تسخیر۔

عطیہ کہتی تھی شاید وہ اسی لیے اپنے گھر سے نکلا ہے۔ کہاں ٹاٹ کے فرش والا مدرسہ، مضافاتی شہر کا ٹوٹا پھوٹا اسکول اور کہاں اتنے بڑے شہر کا چمچماتے ٹائیلوں والا یہ کالج۔ پھر ایک دن کینٹین کے باہر احمد اور عطیہ سیڑھیوں پر بیٹھے آئس کریم کھا رہے تھے۔

میں نے احمد کو چھیڑا، ''تمھیں شرم نہیں آتی، یہاں بیٹھے آئس کریم کھا رہے ہو۔ تمھارے علاقے میں ملتی ہے ایسی آئس کریم اور ایسی لڑکی — میرا مطلب ہے اتنی خوب صورت بے پردہ لڑکی!''

احمد نے غصے سے اپنی آئس کریم نیچے پھینک دی اور دو روز تک مجھ سے اور عطیہ سے بات نہیں کی۔

تیسرے دن میں نے اسے زبردستی پکڑ لیا، ''سوری سکندرِ اعظم — میری بیوقوفی سے ناحق تمھاری آئس کریم کا خون ہوا، خیر تم مجھ سے اس کا بدلہ لے سکتے ہو — میری طرف سے ٹریٹ کی کھلم کھلا آفر ہے — چلو عطیہ کو ڈھونڈتے ہیں۔''

احمد گلے لگ گیا، ''معاف کرنا یار، میں بالکل بھوت بن جاتا ہوں غصے میں۔''

ایک دن عطیہ نے بتایا، ''احمد کو غصے کی حالت میں کچھ ہوش نہیں رہتا۔ وہ بتا رہا تھا کہ کل اس نے اپنے کمرے میں شیشے کا پانی بھرا جگ پھینک کے ٹی وی توڑ دیا جس پر اس کے علاقے میں پیش آنے والے واقعات بتائے جا رہے تھے۔ خبریں اسے سخت ناپسند ہیں۔ کہنے لگا، ''کمرے میں دھواں بھر گیا تھا، توپوں کا دھواں!''

میں نے احمد کو تلاش کیا۔ ایک سبزہ زار کی منڈیر پر بیٹھا وہ دیر سے گیندے کے پھول کی حجامت بنا رہا تھا۔ بہت سی پتیاں اس کے پاؤں کے پاس بکھری پڑی تھیں۔

میں نے کہا، ''یار میں نے سنا ہے تم آج کل نشانے بازی کی مشق کر رہے ہو، ٹی وی توڑ دیا۔ اچھا کیا توڑ دیا مجھے بھی اس پر نظر آنے والی بہت سی شکلیں پسند نہیں ہیں مگر پانی کا جگ مت توڑا کرو۔ صاف پانی یہاں بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے۔'' احمد ہنس پڑا، ''مسخری کرتے ہو، چلو میں غصہ نہیں کرتا۔'' اس نے پھول کی آخری پتی توڑتے ہوئے کہا۔

مگر احمد نے پھر غصہ کیا کیوں کہ عطیہ نے کہا تھا جو کچھ ہو رہا ہے، غلط ہو رہا ہے۔ اس کا اشارہ اس تباہی کی طرف تھا جو بستیوں میں آئے دن دھماکوں سے ہو رہی تھی۔ ''کتنے لوگ مر رہے ہیں، مرد، عورتیں اور بچے۔''

''اور کیا صحیح ہو رہا ہے؟'' احمد نے تڑخ کے پوچھا۔

''ہمیں چاہیے کہ غلط باتوں کو صحیح کریں، احمد!'' عطیہ بولی، ''یہ جو نوعمر لڑکے، یہ خودکش جیکٹوں والے، بھلا یہ ان کے مرنے کے دن ہیں — اور اس طرح کہ بدن کے پرزے اڑ جائیں۔''

احمد کی آنکھوں میں اچانک سرخ شعلہ لپکا۔ پھر وہ اٹھا اور چلا گیا اور اس کے بعد تین دن تک نظر نہیں آیا۔

میں نے عطیہ سے پوچھا، ''کیا بات ہے، احمد بھائی منظرنامے سے پھر غائب ہیں۔ ناراض تھے، ناراض ہیں یا ابھی کچھ دن اور ناراض رہیں گے؟ اللہ ان کے گھر کی چیزوں پر رحم کرے — ذرا ان سے فون کرکے پوچھنا انھیں پانی کا نیا جگ تو نہیں چاہیے — ٹی وی سیٹ مہنگا ہوتا ہے، وہ اپنے بجٹ میں نہیں آسکتا۔''

''کل فون آیا تھا۔'' عطیہ نے جواب دیا، ''وہ ہفتے بھر کے لیے گھر جا رہا ہے۔''

ایک ہفتہ گزر گیا، پھر دو ہفتے گزر گئے۔ احمد واپس نہیں آیا۔ پھر ایک دن عطیہ کے پاس اس کے موبائل فون پر ایک برقی پیغام جھلملایا، ''میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیسا فیصلہ؟'' عطیہ نے پوچھا۔

''واپس نہ آنے کا!''

پھر عطیہ نے بھی ایک فیصلہ کیا۔ امتحان کا نتیجہ آنے کے بعد اس نے اسلام آباد جانے کا ارادہ کرلیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں ایک این جی او اسے بھا گئی تھی۔ ''میں وہاں ملازمت کروں گی۔'' وہ خوش ہو کے بولی۔

''این جی او کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس لیے کہ وہ خلقِ خدا کی بہتری کے لیے کام کر رہی ہے۔ 'زندہ لوگ' ہے اس کا نام۔ اس لیے وہ ان لوگوں کو زندہ ہونے کا احساس دلاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ زندگی ان کے کام کی نہیں۔'' اور وہ خوشی خوشی وہاں چلی گئی۔

اسے گئے ہوئے کافی دن ہوگئے تھے۔ میرا اس سے رابطہ قائم تھا مگر موبائل فون کے ایسے کنکشن کی طرح جس کے سگنل بار بار غائب ہوجاتے ہیں۔ اس کی چھوٹی بہن

خدیجہ البتہ مجھے اس کے بارے میں تازہ خبروں سے آگاہ رکھتی تھی۔

...عطیہ نے شادی کا ایک اور پیغام ٹھکرا دیا ہے اور خوش ہے...

...عطیہ کو ''زندہ لوگ'' کے اس شعبے کا سربراہ بنا دیا گیا ہے جو نابینا لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

...عطیہ کو ہلالِ احمر کی طرف سے اعزاز دیا گیا ہے۔

...عطیہ کو روٹری کلب کی تاحیات رکنیت دی گئی ہے اس کے رفاہی کاموں کی وجہ سے...

اخباروں میں بھی فلاحی سرگرمیوں کی بنا پر عطیہ کے نام کی گونج سنائی دیتی رہی۔ ایک بار ایک ٹی وی شو میں سابق ٹیسٹ کیپٹن اور بالر وسیم اکرم عطیہ کو ذیابیطس کے مریضوں کی طرف سے خراجِ تحسین پیش کرتے نظر آئے۔

میں نے ایک بار اس کی اس قسم کی کارروائیوں سے اکتا کے خدیجہ کے ذریعے پیغام بھیجا کہ وہ اتنی سخت محنت کر کے کیوں اپنے آپ کو تھکا رہی ہے؟

''بدن کام کرنے کے لیے ہی تو بنا ہے...'' اس کا ای میل آیا۔

میں نے جواب داغا، ''تم بہت ہمت والی ہو بھئی مگر بدن کم زور ہوتا ہے— کچھ آرام بھی کیا کرو— کچھ اور بھی سوچو۔ آخر اور بھی تو معاملات ہیں— کچھ ان کے بارے میں غور فرماؤ۔ ارے بھئی کچھ اور بھی 'زندہ لوگ' ہیں جو تمھاری توجہ چاہتے ہیں!'' وہ جواب گول کر گئی۔

اچانک ایک دن خدیجہ کا ای میل آیا— ''وہ اپنا ایک گردہ کسی کو دے رہی ہے، تحفے میں—''

''کیا؟ دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا؟'' میں نے ای میل کے برقی لفافے میں انگارے بھیجے۔

''تمھیں کیا اعتراض ہے؟'' اس کا جواب آیا، ''میرا گردہ ہے، میں دے رہی ہوں اور جسے دے رہی ہوں اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے— اپنے ماں باپ کا اکلوتا

بیٹا ہے وہ اور اس کی جوان بیوی ہے— ان کی شادی کو صرف آٹھ مہینے ہوئے ہیں۔ ایک گردہ پورے خاندان کی خوشی سے زیادہ قیمتی تو نہیں۔''

''مگر تم اپنے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں پاگل لڑکی— تم اپنے بدن کا ایک ٹکڑا یوں ہی— اللہ کے نام پر... یار جذباتیت کی بھی کوئی حد ہے!''

میں نے خدیجہ کو بھی پیغام بھیجا، ''تم تو اسے روکو!''

خدیجہ نے لکھا، ''میں بھلا اسے روک سکتی ہوں— اس فولادی عورت کو!''

میں نے پھر اسے باز رکھنا چاہا، ''اپنے بدن کا قتلہ کسی اور کو بخشنے سے پہلے سوچو، شاید یہ تمھارے لیے ٹھیک نہ ہو۔''

مگر وہ بپھر گئی، ''بدن کیا ہے۔ بس ایک پھلجھڑی، ویسے یہ بات میں نے احمد سے بھی کہی تھی۔ تمھیں پتا ہے۔ میں نے ایک شعر پڑھا تھا اس کے سامنے، تمھیں بھی سناتی ہوں:

یوں تو ہم کچھ نہ تھے پر مثلِ انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشا نکلا

احمد نے کہا، واہ کیا بات ہے، لگتا ہے جیسے شاعر نے یہ شعر فدائین کے لیے کہا ہو۔ واقعی کتنا سچ ہے۔ وہ اپنے بدن کو پھلجھڑی سمجھتے ہیں— بدن کے بخیے۔ وہ مقصد کی خاطر اپنے بدن کو خیرات کر دیتے ہیں۔ مگر میں نے کہا، ہرگز نہیں، بدن مقدس ہوتا ہے، عطیۂ خداوندی، اسے اس طرح پامال کرنا— تو اس کی بے حرمتی ہوئی— مگر وہ ناراض آدمی اور زیادہ ناراض ہو گیا—!''

عطیہ کی بات کے جواب میں، میں نے لکھا، ''تم نے صحیح کہا، اللہ کے عطیے کو اس طرح پامال کرنا ٹھیک نہیں— اپنے بدن کی حفاظت کرو بی بی— کسی کو اپنا گردہ وردہ مت دو!''

مگر وہ سب کو ناراض کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ وہ مانی نہیں۔

اور پھر گردے کا تحفہ قبول کرنے والا تو زندہ رہا مگر تحفہ دینے والی چل بسی۔

آپریشن کامیاب ہونے کے کئی ہفتے کے بعد — اس کی موت اچانک حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے ہوئی۔ خدیجہ نے لکھا تھا۔

ہوائی اڈے پر کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی میری پرواز دو گھنٹے کی تاخیر سے وہاں پہنچی تھی۔ مجھے عطیہ کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا مگر میں باآسانی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اس شہر میں اتنی مشہور تھی کہ راستے خود بہ خود میرے سامنے بچھتے گئے۔

جس وقت میں وہاں پہنچا، جنازہ اٹھنے والا تھا۔ ہلالِ احمر کی ایمبولینس میں عطیہ کی میت سوگواروں کے ہجوم کے ساتھ قبرستان کی طرف روانہ ہوئی۔ میں بھی ساتھ ہولیا۔ قبرستان کی مسجد میں نمازِ جنازہ اور پھر تدفین — میں تمام وقت وہاں موجود رہا مگر ذہن آوزوں سے گونجتا رہا — کبھی دور کبھی قریب کی آوازیں۔

جنازے میں عطیہ کے تمام رشتے دار، دوست اور ساتھی شامل تھے، مختلف اداروں کے نمائندے بھی جنھوں نے اس کی قبر پر پھول چڑھائے۔

اچانک میرے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص نے دوسرے سے کہا، ''وہ ہمارے ادارے کی مستقل بلڈ ڈونر تھیں، ہر وقت خون دینے کے لیے تیار رہتی تھیں۔''

مجھے یاد آیا، ایک بار خدیجہ نے بھی کہا تھا۔ اب اس پر خون کے عطیات دینے کا جنون سوار ہے۔ کئی بار خون کی کمی کا شکار بھی ہوئی، ڈاکٹروں نے منع بھی کیا مگر نہیں — اس کا خیال ہے کہ وہ تمام مرد اور عورت جنھیں جینے کے لیے خون کی ضرورت ہے، ان سے اس کا خون کا رشتہ ہے اور اس رشتے کو وہ نہیں بھلا سکتی۔ عجب سرپھری عورت ہے۔

قبرستان سے واپسی پر عطیہ کے گھر کے ایک کمرے میں سوگوار خواتین اور مرد سفید چاندنی پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ پھر خدیجہ سفید دوپٹے میں اپنا سر چھپائے اندر داخل ہوئی، اس کی آنسو بھری آنکھوں میں بہت سے سوال تھے۔ میں اٹھ کے اس کے پاس گیا اور تسلی کے لیے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے مجھے روک دیا — ''کچھ مت کہیں، میں جانتی ہوں، وہ یہی چاہتی تھی۔''

میں چپ رہا، پھر آہستہ سے بولا، ''کاش ہمارے پاس احمد کا پتا ہوتا تو ہم

اسے بھی...''

''احمد— '' خدیجہ سرد لہجے میں بولی، '' کچھ دن پہلے اس کے کسی ساتھی کا پیغام آیا تھا۔ احمد یہاں سے چلا گیا ہے بدن میں آتش فشاں سمیٹے، کسی نامعلوم بستی کی طرف، وہاں کی فضاؤں میں جل بجھنے کے لیے— اور عطیہ نے کہا تھا، کتنا آسان ہے اس طرح مرنا— افسوس یہ کیسے لوگ ہیں جو مرنے کے لیے مرتے ہیں!'' میں نے کہا، ''عطیہ سچ کہتی تھی—!''

خدیجہ نے آنکھیں اٹھائیں، ''ایک اور بات بتاؤں آپ کو— مرنے سے بہت پہلے عطیہ نے ایک اور کام کیا تھا— اس نے 'زندہ لوگ' کے منتظمین کو اپنی وصیت لکھ کے دی تھی کہ اس کی آنکھیں اس کے مرنے کے بعد کسی مستحق شخص کو دے دی جائیں۔''

''آنکھیں؟'' میں حیران ہوا۔

''جی ہاں، وہی آنکھیں جن کے بارے میں آپ کہتے تھے کہ عطیہ اپنی آنکھوں سے سوچتی ہے— ان سوچتی آنکھوں کے پھول اب اس لڑکے کے چہرے پر کھلیں گے جو بم کے ایک دھماکے کے بعد بینائی سے محروم ہوگیا ہے۔'' خدیجہ سسکیاں بھرنے لگی۔

میں نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا، ''روؤ مت— عطیہ نے کتنی خوب صورتی سے اپنے بدن کو مرنے سے بچا لیا ہے— وہ مری کب ہے، وہ تو زندہ ہے اتنے سارے زندہ لوگوں میں— وہ سخی عورت!''

ڈیزائنر بے بی

عجب خواب تھا۔ شہناز نے دیکھا، کھلی کھڑکی سے ایک درخت کی لمبی سی ہری شاخ اندر آگئی ہے جس پر ایک سرخ پھول کھلا ہوا ہے۔ اس نے چاہا کہ پھول کو چھوئے مگر پھول دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا ہوگیا کہ وہ گھبرا گئی۔ پھر اسے اس کے اندر سے کسی بچے کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے پھول کے اندر جھانکا تو گلابی اور زرد پتیوں کے ریشمی پردوں کے پیچھے اسے کوئی بچہ چھپا ہوا نظر آیا۔ وہ ہاتھ ہلا کے اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کے اسے پکڑنا چاہا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور پھر زور سے ہنسا۔ بچے کا چہرہ شہناز کو نظر نہیں آیا۔ وہ چاہتی تھی کہ خود پھول میں اتر جائے اور بچے کا پیچھا کرے مگر اسی وقت پھول میں سے روشنی کی ایک تیز کرن نکلی اور اس کی آنکھوں میں تیر گئی۔

شہناز نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کھڑکی کھلی تھی جس میں سے سورج جھانک رہا تھا۔

وہ ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی اور اسے ایسا لگا جیسے بہت سے بچے ایک ساتھ اس پر ہنسے ہوں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور حیران ہوگئی۔ ہر طرف بچے ہی بچے تھے۔ نیلی آنکھوں والا ایک پیارا سا بچہ جس کی پیشانی پر سنہرے بالوں کی جھالر لٹک رہی تھی عین اس کی مسہری کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے ننھا سا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا اور پیچھے ہٹا۔ شہناز نے گردن موڑی تو ایک اور گول مٹول لڑکے نے سر ہلا کے اسے ہیلو کہا۔ شہناز نے تکیے

پر ٹیک لگا کے بستر سے اٹھتے ہوئے دیکھا، کوئی دیوار خالی نہیں تھی۔ سارا کمرہ خوب صورت، بھولے بھالے اور روشن روشن ہنستے چہروں والے بچوں کی خوشیوں سے بھری آوازوں سے لبالب بھر گیا تھا۔

اچھا...شہناز مسکرائی— تو یہ کمال کی کارستانی تھی۔

''دیکھ لینا۔'' اس نے کہا تھا، ''راتوں رات تمھارے بیڈ روم میں بچوں کی نرسری نہ کھول دوں تو کہنا۔ ماما سچ ہی تو کہتی ہیں۔''

اور ماما نے کہا تھا، ''اگر اس حالت میں حسین بچوں کی تصویریں دیکھی جائیں تو پیدا ہونے والا بچہ بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ اب یہ کوئی نصیحت تھی، بچہ سازی کا کوئی روایتی ٹوٹکا یا محض ایک معصوم خواہش، یہ بات کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی مگر جب سے وہ اپنے شوہر کے ساتھ آدھی دنیا کے برابر سمندر پار کر کے اتنی دور آئی تھی اور گھر والوں کو پتا چلا تھا کہ سفید بگلا ان کے گھر کی سمت پرواز کرنے والا ہے، اس قسم کے پیغامات بڑے تواتر سے اس کے پاس آنے لگے تھے۔ اگرچہ اب خط لکھنے کا زمانہ تو تھا نہیں مگر ماما اور نانی نے ای میل کے ذریعے اپنے نجی مشورہ کلینک کے سارے دروازے اس پر کھول دیے تھے جس میں زچہ و بچہ کی دیکھ بھال کے انوکھے رموز سمجھائے جاتے تھے۔ یہ سارے مجرب نسخے سینہ بہ سینہ، نسل در نسل منتقل کیے جاتے تھے۔

''اور سنو میری بیٹی— '' ماما لکھتیں، ''اپنے کھانے پینے کا خاص خیال رکھو، دودھ، پھل، سیب کا عرق۔ بچے کی خوب صورتی اور تندرستی کے لیے یہ سب ضروری ہے، اور پابندی سے ماں اور بچوں کی صحت کے بارے میں اچھی اچھی ویب سائٹس دیکھتی رہو۔ کون سی ورزش اس حالت میں ضروری ہے، کون سے کپڑے مناسب رہیں گے۔ اب تم اونچی ایڑی کے جوتے تو نہیں پہنتیں، اپنے لیے ڈھیلے ڈھالے گاؤن سلوا لو۔ پھر اچانک انگریزی فقرے اردو میں ڈھلنے لگتے۔ اور سنو تمھاری نانی بھی تمھارے لیے پریشان رہتی ہیں۔ ان کی ہدایت ہے کہ اپنے کمرے میں خوب صورت بچوں کی تصویریں لگاؤ اور ان سب پیارے پیارے بچوں سے میل جول بڑھاؤ جو تمھارے پڑوس میں رہتے ہوں۔''

کمال ان پیغامات سے بہت لطف لیتا، ''مجھے پتا نہیں تھا کہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی اور کلوننگ کی ٹیکنالوجی کے دیاروں سے اتنی دور بسنے کے باوجود تمھاری ماما اور نانی بھی ایسے گر جانتی ہیں جن سے 'ڈیزائنر بے بی' پیدا ہو سکتے ہیں۔'' وہ کہتا۔

''یہ ڈیزائنر بے بی کیا ہوتا ہے؟'' وہ حیران ہو کے پوچھتی۔

''یہ وہ بچہ ہے جسے کسی خاص سانچے میں ڈھال کیا تیار کیا جائے۔ اپنی مرضی کے مطابق۔'' کمال ہنس کے کہتا۔

''کمال تم بھی — ؟'' وہ کہتی، ''ماما اور نانی تو اس دنیا کو خوب صورت ترین لوگوں سے بھر دینا چاہتی ہیں۔ وہ اس قسم کی ہدایتیں گھر کی صفائی کرنے والی ماسی سے لے کر ہر اس عورت کو دیتی رہتی ہیں جس کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہو کہ وہ ماں بننے والی ہے، مگر کمال تم تو ایسی باتیں مت کرو۔''

''کیوں نہ کروں؟'' کمال کہتا، ''خوب صورت بچے کسے اچھے نہیں لگتے۔ ماؤں کو تو اس فن میں طاق ہونا ہی چاہیے۔ اور میری رائے میں تو اگر کسی بچے کو دیکھ کر اس پر پیار نہ آئے تو اس کے لیے اس کی اماں کو قصوروار ٹھہرانا چاہیے۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ تم اپنی ماما اور نانی کے مشوروں پر پوری طرح عمل کرو تا کہ ہمارے خاندان کے لیے ایک پیارا ننھا سا فرشتہ آسمان سے اترے۔ سمجھیں میری پیاری شہناز بیگم!''

''وہاٹ ربش'' (What rubbish)۔ شہناز چڑ کے بولی، ''کیا عورتوں کے اندر کوئی فیکٹری لگی ہوتی ہے جہاں آرڈر پر مال تیار کیا جاتا ہے؟''

''خفا مت ہو یار۔'' کمال پھر ہنسا، ''میں تو مذاق کر رہا تھا مگر تمھاری ماما کے احکامات کو ٹالا بھی تو نہیں جا سکتا۔''

شہناز کمرے سے باہر آئی تو ٹی وی لاؤنج میں کمال اپنی پسندیدہ آرام کرسی پر نیم دراز اخبار کی سرخیوں میں کھویا ہوا نظر آیا۔

شہناز کے قدموں کی چاپ سن کے اس نے نظر اٹھائی، ''ارے اتنی جلدی اٹھ گئیں؟'' اس نے پوچھا۔

''بچوں کے شور نے اٹھا دیا۔'' وہ ہنس کے بولی، ''تم نے تو گھر میں پورا چڑیا گھر کھول دیا۔''

کمال نے کہا، ''چڑیا گھر؟ غضب خدا کا۔ اتنے سارے بچے کبھی تم نے پہلے دیکھے ہیں؟ مجھے داد نہیں دو گی کہ میں نے زبردست آرٹ گیلری سجائی ہے راتوں رات۔ اب تم ہمیں ہرگز مایوس نہیں کرسکتیں۔''

''پھر وہی۔'' شہناز تنک کے بولی، ''لاؤ ذرا اخبار مجھے دو۔''

''نہیں، نہیں۔'' کمال نے اخبار تہہ کرکے ایک طرف ہٹایا، ''یہ تمھارے کام کا نہیں۔''

''کیوں؟'' شہناز نے پوچھا۔

''اخبار چھوڑو۔'' وہ بولا، ''میں تمھارے لیے چائے بناتا ہوں۔ گرما گرم ایک کپ پیوگی تو آنکھیں پوری طرح کھل جائیں گی اور بچے زیادہ خوب صورت نظر آئیں گے۔''

''ابھی نہیں۔'' شہناز نے جواب دیا، ''میں پہلے نہاؤں گی۔'' وہ غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

اسی دن اسے ماما کی جانب سے نیا برقی مکتوب ملا، ''بیٹی ان دنوں اخبار مت پڑھا کرو۔''

''اخبار بھی نہ پڑھوں، کیوں؟'' اس نے کمال سے سوال کیا، ''آخر انسان کبھی کبھی یہ بھی تو جاننا چاہتا ہے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اخبار نہیں تو ٹی وی ہی سہی، مگر تم وہ بھی نہیں دیکھنے دیتے۔ ہر وقت اس پر فٹ بال، بیس بال یا ٹینس کے میچ دیکھتے رہتے ہو۔ انٹرنیٹ پر مجھ سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا۔''

''تم بھی ٹی وی پر بس اسپورٹس کے پروگرام دیکھا کرو۔'' کمال بولا، ''آدمی ہنستا کھیلتا کیسا اچھا نظر آتا ہے، خبروں میں کیا رکھا ہے سوائے... خیر جانے دو۔''

شہناز کو کھانا کھاتے ہوئے بڑے زور سے اُبکائی آئی اور وہ غسل خانے کی طرف لپکی۔ جب وہ واپس آئی تو کمال نے پوچھا، ''آج کل تمھارا جی سوندھی چیزیں کھانے کو نہیں چاہتا؟''

شہناز نے اسے مسکرا کے دیکھا، ''تمھیں یہ عورتوں والی سب باتیں کیسے پتا ہیں؟''

''کیسے پتا نہیں ہوں گی؟'' کمال نے جواب دیا، ''آخر بچپن سے عورتوں کی صحبت میں رہا ہوں۔ ان میں سے ایک میری ماں تھیں، دوسری خالائیں، پھوپھیاں اور بہنیں۔ ویسے شبِ برأت آنے والی ہے، میں اس روز تمھارے لیے چنے کا حلوہ بناؤں گا۔ یقین مانو بڑا دھانسو باورچی ہوں۔'' ''باورچی یا شیف؟'' شہناز نے کہا، ''اب تو سب شیف کہلاتے ہیں۔ ویسے ماما نے بھی تو ای میل بھیجا تھا کہ تم شبِ برأت میں بہت یاد آؤ گی۔ اس دن ہم سب ساتھ مل کے جاتے تھے، قبروں پر چراغ جلانے اور سمندر میں عریضے ڈالنے۔ پھلجھڑیوں والی رات۔ جب سب دعائیں پوری ہوتی ہیں، نیک روحیں گھروں میں آتی ہیں اور فرشتے رحمتوں اور برکتوں کے تحفے لے کر زمین پر اترتے ہیں۔''

''اور خوب حلوے کھاتے ہیں۔'' کمال نے ٹکڑا لگایا، ''اسی وجہ سے اگر حلوے کو جنت کا میوہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔''

''اب بے چارے فرشتوں کو یہاں کا پتا تو معلوم نہیں، تم انھیں کیسے اپنا بنایا ہوا حلوہ کھلاؤ گے؟'' شہناز نے مسکرا کے پوچھا۔

کمال نے جواب دیا، ''اس کی تم فکر مت کرو۔ میں نے بہت سارے فرشتے اس گلی میں بھی دریافت کر لیے ہیں۔ ان کے نام ہیں پوکی، پیچو، علیشا، ٹینا اور میری اور ان کے بہت سارے دوست۔''

''مگر یہ ہیں کون؟'' شہناز نے تعجب سے پوچھا۔

''ارے تم اپنے محلے کے ان محبوب ستاروں کو نہیں جانتیں؟ یہ سب وہ پیارے پیارے بچے ہیں جو ہنستے ہیں تو ان کے لان پر پھول کھلتے ہیں۔ کچھ یہیں کے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے ماں باپ پاکستان، ہندوستان، ایران، افغانستان اور دیگر ملکوں سے آئے ہیں۔ میں ان سب کو تم سے ملواؤں گا۔ تمھیں تو دنیا کے سارے خوب صورت بچوں سے دوستی کرنی چاہیے۔'' کمال نے کہا۔

شبِ برأت آئی تو کمال نے گھر میں چراغاں کیا۔ پھلجھڑیاں جلائیں اور گھر چنے کے حلوے کی سوندھی خوش بو سے مہک اٹھا۔ گلی کے فرشتوں سے یہ شہناز کی پہلی ملاقات

تھی۔ پوکی جس وِلا میں رہتا تھا، وہ گلی کے شروع میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں کی پھلجھڑیاں چھوٹتی تھیں۔ پیچو کے ماں باپ پڑوس والے گھر میں رہتے تھے۔ پیچو کے کان بڑے تھے اور پیشانی پر طلوع ہوتے ہوئے چاند کا سا نشان تھا۔ وہ سب کی باتیں بڑے غور سے سنتا تھا اور بات بات پر قہقہے لگاتا تھا۔ علیشا کی کاٹیج کے سامنے میپل کا پیڑ تھا جس پر جب پیلی چونچ والا ایک پرندہ گیت گاتا تو علیشا ناچتے ناچتے گھر سے نکل آتی تھی۔ ٹینا اور میری دو بہنیں تھیں۔ وہ اپنی چوٹیوں میں ہر وقت لال ربن کے گلاب سجائے رکھتیں۔ ٹینا چھوٹی تھی اور میری بڑی۔ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے چپکی رہتیں۔ وہ ایک ساتھ اپنے گھر سے نکلتیں اور ایک ساتھ واپس جاتی تھیں۔

سب بچوں نے کمال کی بنائی ہوئی پاکستانی کینڈی بہت پسند کی۔ کمال اور شہناز کو بھی یہ کینڈی پسند تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بے مثال مٹھائی ان کے آنے والے بچے کو بھی مرغوب ہوگی کیوں کہ کینڈی سب بچوں کو پسند ہوتی ہے اور سب بچے مل کے اس دن کا انتظار کرتے ہیں جب فرشتے گھروں میں آتے ہیں۔ سب مل کے کینڈی کھاتے ہیں۔ ہر طرف روشنیاں ہوتی ہیں اور پٹاخوں کا بازار گرم ہوتا ہے۔

تو شبِ برأت آئی اور گزر گئی۔ مگر کہاں گزری۔ ماما کا ای میل آیا۔ لگتا ہے کہ پٹاخوں کا سیزن اب کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے۔ پٹاخے اور دھماکے! موت گاڑیوں کے ہارن۔

کمال نے سوچا، خبریں خون سے سرخ ہوگئی ہیں۔

کمال کو شہناز کی فکر تھی۔ کچھ دنوں سے اس کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ ماما نے پھر ای میل بھیجا، ''اپنا بہت خیال رکھو۔ بچہ امانت ہوتا ہے، ماؤں پر لازم ہے کہ وہ پوری دنیات کے ساتھ اسے مستقبل کے حوالے کریں۔''

کمال نے بتایا، ''ڈاکٹر کہہ رہی تھی بچے کا سفر جاری ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ خوشی خوشی اس کے استقبال کی تیاری کرو۔ ایک نیک فرشتے کی آمد کا جشن، ڈیزائنر بے بی!''

شہناز ہنسی، ''بچے سچ مچ فرشتے ہوتے ہیں۔ وہ خوشیاں ساتھ لاتے ہیں، خوشیاں بڑھاتے ہیں، خوشیاں پھیلاتے ہیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تو ہمیں پتا نہیں تھا کہ

ماما، پاپا اور نانی ہمیں کیوں ہر وقت ہنستے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اب پتا چلا کہ اس سے انھیں کتنی خوشی ملتی تھی۔''

کمال نے کہا، ''اب تم ماں بننے والی ہو اور تمھارا کام بڑھ گیا ہے اور تمھاری ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمھیں خوش رہنا ہے تاکہ آنے والا خوش رہے اور سب کو خوش رکھے۔''

شہناز نے کہا، ''واقعی خوشیاں کتنی کم ہوگئی ہیں۔ مگر اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ کیا وہ واقعی بہت سی خوشیاں لے کر آئے گا؟''

کمال نے کہا، ''گلی کے سب فرشتے تمھارے ساتھ ہیں۔ وہ سب آئیں گے ہنستے اور کھلکھلاتے ہوئے۔ وہ سب خوب صورت بچے جو خوشیوں کی سوغات تقسیم کرتے ہیں، وہ شاید آج پھر تمھارے پاس آئیں گے۔''

''کیوں؟ آج کیوں؟'' شہناز نے سوال کیا۔

''تمھیں سلام کرنے — تم سے تحفے لینے۔''

اس وقت اچانک درد کی ایک تیز لہر کہیں اندر سے اٹھی اور شہناز کے پورے وجود کو بھگو گئی۔ وہ کمرے میں چلتے چلتے لمحے بھر کو رکی اور میز کا کونہ پکڑ کے آگے کی طرف جھک گئی۔

''کیا ہوا؟'' کمال نے لپک کے اسے سہارا دیا۔ شہناز گہرے گہرے سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیسا لگ رہا ہے؟'' کمال نے پریشان ہو کے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' شہناز بولی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

کمال نے کہا، ''چلو فوراً اسپتال چلتے ہیں۔ میں گاڑی نکالتا ہوں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

اسی وقت گھنٹی بجی۔ کمال نے دروازہ کھولا تو کئی عجیب و غریب شکلیں اندر آگئیں۔ سب سے پہلے ڈریکولا تھا۔ اس کے کان لمبے تھے اور کونے والے دو خون آلود دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے فرینکسٹین کی زندہ لاش اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ اس کے

بعد اپنے سروں پر پھنکارتے سانپوں کے پھن سجائے میڈوسیلاسٹرز اندر گھس آئیں۔ پھر دیکھتے دیکھتے کچھ اور انسانی جانوں کے دشمن عفریت، چڑیلیں اور شیطانی ہیولے ناچتے ہوئے آگے بڑھے۔

عجب بھوت میلہ تھا!

شہناز نے ڈر کے چیخ ماری تو کمال نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا، ''ڈرو نہیں، یہ سب بچے ہیں اور تم سے کینڈی مانگنے آئے ہیں۔ یعنی حلوہ!''

''کیوں آج کوئی شبِ برأت ہے؟'' شہناز نے حیران ہو کے پوچھا۔

''ہاں!'' کمال بولا، ''شبِ برأت ہی سمجھو مگر اس میں بدروحیں گھروں میں آتی ہیں اور یہ سب بچے پوکی، پیچو، علیشا، ٹینا اور میری، یہ سارے ڈیزائنر بچے آج بھوت بن کے خوش ہیں۔ یہ بھوتوں کی شام ہے بھئی — ہیلووین کی شام!''

شہناز نے پلٹ کے دیکھا۔ کمال کی غلطی سے ٹی وی کھلا رہ گیا تھا جس پر دور سے خبریں آ رہی تھیں اور بم کے دھماکے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد بتائی جا رہی تھی جس میں خودکش حملہ آور بھی شامل تھا۔ وہ ایک چھوٹا لڑکا تھا اور اس کا سر بھی انسانی اعضا کے ڈھیر میں ملا تھا۔

سر کٹے نے آفت مچا دی تھی۔

ٹی وی سے نظریں ہٹا کے شہناز نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور بے اختیار رونے لگی۔ کمال نے تیزی سے آگے بڑھ کے ایک بار پھر اسے سنبھالا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

شہناز گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی اور اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کے روتے ہوئے بولی، ''کیا اب سب بچے ایسے...''

نامعلوم شخص

اخبار نیا تھا مگر خبریں سب پرانی تھیں۔ ہر صفحے پر بوسیدہ سرخیاں مردہ جونکوں کی طرح چمٹی ہوئی تھیں۔

گلی کے نکڑ پر دو نامعلوم افراد نے راہ گیر کو پستول دکھا کے لوٹ لیا۔

بھرے بازار میں نامعلوم اشخاص کی فائرنگ سے بھگدڑ مچ گئی۔

چائے خانے میں بیٹھے لوگوں پر نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دو اشخاص ہلاک، بہت سے زخمی۔

نامعلوم— نامعلوم— نامعلوم، میں نے سوچا، آخر یہ نامعلوم لوگ کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں، کوئی انھیں پکڑتا نہیں، کوئی انھیں پہچانتا نہیں۔ پولیس، خفیہ ایجنسیاں، دیگر ادارے— سب بے بس— کون ڈھونڈے گا انھیں؟

اسی وقت باہر کی گھنٹی زور سے بجی۔ کون ہوسکتا ہے؟ میں نے سوچا۔

گیٹ کھولا تو ایک موٹر سائیکل سوار زن سے اندر گھس آیا۔ اس کا چہرہ ہیلمٹ میں چھپا ہوا تھا اور شیشے میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

''کون ہو تم؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں— '' اجنبی نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے کہا، ''تم مجھے نہیں جانتے، کوئی

بات نہیں، جان لو گے۔ جب کوئی مجھے یاد کرتا ہے تو میں وہاں پہنچ جاتا ہوں۔'' اس کی موٹر سائیکل زور سے غرائی۔

''میں تمھیں یاد کر رہا تھا، نہیں تو—'' میں نے کہا، ''تم ہو کون بھئی؟''

''میں—'' موٹر سائیکل سوار بولا، ''ایک نامعلوم شخص، اور کون!''

''تو—'' میں ڈر کے پیچھے ہٹ گیا، ''کیوں آئے ہو؟''

''نامعلوم افراد کیوں آتے ہیں گھروں میں—'' اس نے کہا اور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

یقیناً پستول ہوگا اس میں—میں نے سوچا۔

اس نے جیب سے ہاتھ باہر نکال لیا۔ چیونگم کا ایک پیکٹ تھا اس کے ہاتھ میں—اس نے ہیلمٹ کا شیشہ اٹھا کے چیونگم کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں رکھا اور ایک مجھے دیا—

''تم بھی لو—'' اس نے کہا، ''میں سمجھا...'' میں بولا۔

''کہ میں پستول نکال رہا ہوں جیب سے۔'' اس نے میری بات مکمل کردی۔ ''میں جیب میں پستول نہیں رکھتا، میں تو...'' اس نے اپنی جیکٹ کی اوپر والی پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کیا جس میں زپ لگی تھی۔

''دستی بم ہے اس میں۔'' وہ بولا۔

''جیب میں دستی بم؟'' میں نے حیران ہو کے اسے دیکھا۔

''جیب خالی جو ہے۔'' اس نے کہا، اسے دستی بم سے بھر دیتا ہوں، پستول میں ہمیشہ اپنی بیلٹ میں...'' اس نے اپنی کمر کی طرف اشارہ کیا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''اچھا سوال ہے۔'' وہ ہنسا— ''تم خود بتاؤ، میں کیوں آیا ہوں یہاں؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔'' میں بولا، ''یہاں تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔'' فریج میں کھانے کو کچھ نہیں، پرس بھی خالی ہے، ادھار پر کام چل رہا ہے یا پرانے اخبار بیچ کے— تنخواہ جو نہیں ملی دو مہینے سے۔'' ''کوئی بات نہیں۔'' وہ اطمینان سے بولا، ''مجھے

کوئی بھوک ووک نہیں ہے اور پیسے بھی نہیں چاہییں۔''

''پھر — ؟''

''پھر کیا، دو ایک گھنٹے سوؤں گا تمھارے یہاں پنکھے میں — بہت تھکا ہوا ہوں۔''

''پنکھے میں۔'' میں حیران ہوا، ''فی الحال تو بجلی بھی نہیں، تمھیں پتا نہیں لوڈ شیڈنگ کا کیا حال ہے۔ اب ایک گھنٹے سے پہلے تو بجلی آئے گی نہیں۔''

''اچھا'' وہ موٹر سائیکل کو اس کونے میں لے گیا جہاں میں کبھی اپنا اسکوٹر کھڑا کرتا تھا۔ اس نے خاموشی سے وہاں اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی اور مڑ کے بولا، ''یہاں فرش پر تیل کے دھبوں سے پتا چلتا ہے کہ شاید تمھارے پاس بھی کوئی اسکوٹر وسکوٹر ہے۔''

''کبھی تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ گھر کے باہر کھڑا تھا، کوئی لے گیا۔''

''ہوں۔'' وہ سر ہلا کے بولا، ''کوئی ضرورت مند ہوگا۔''

''ضرورت مند تو میں بھی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو کر لو نا اپنی ضرورت پوری۔'' وہ بولا، ''سڑکوں پر اتنی بہت ساری...'' وہ چپ ہوگیا۔ یہی بات تو میں بھی کتنے دنوں سے سوچ رہا ہوں مگر... میں نے دل میں کہا۔

اچانک اجنبی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا، ''آؤ اندر چلتے ہیں۔''

''ہیلمٹ تو اتار دو۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا، ''چہرہ کیوں نہیں دکھاتے، اپنی شکل پسند نہیں ہے کیا؟''

وہ ہنسا، ''دلچسپ آدمی ہو۔ میں اپنا چہرہ کسی کو نہیں دکھاتا۔''

''کیوں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا کمرے میں گھس گیا۔ اندر چیزیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ ایک کونے میں مسہری پر میری میلی جینز پھیلی ہوئی تھیں۔ برابر میں بید کی کرسی پر ایک تولیہ آدھا اوپر اور آدھا فرش پر لٹکا ہوا تھا۔ تپائی پر دو ایک کتابیں، اخبار اور پانی کا ایک خالی گلاس —

اجنبی نے بستر پر پڑی جینز کو اپنے جوتے کی نوک سے فرش پر گرا دیا اور مسہری پر نیم

دراز ہوگیا۔ ''اکیلے رہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بے کار سوال ہے— گھر کی حالت نہیں دیکھ رہے ہو؟'' میں نے جواب دیا۔

''دیکھ رہا ہوں۔'' وہ بولا، ''چھڑے ایسے ہی رہتے ہیں— مگر سوال یہ ہے کہ...''
اس نے ہیلمٹ کے شیشے کو ذرا سا اوپر سرکایا۔

''تم ہر وقت ہیلمٹ کیوں پہنے رہتے ہو؟'' میں نے ایک بار پھر پوچھا، ''الجھن نہیں ہوتی— ویسے بھی گرمی کتنی ہے، کہو تو کھڑکی کھول دوں؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ ''کتے پیچھے تھے، کیا پتا ابھی وہ آس پاس ہوں۔''

''کون سے کتے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کتے تو کتے ہوتے ہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا، ''کام ختم ہوتے ہی باہر ٹکراؤ ہوگیا مگر خیر، ہوا کچھ نہیں۔ ساتھی تو نکل گیا مال سمیت، کتے میرے پیچھے پڑ گئے، مگر پھر... یار تمھارا گھر بڑی اچھی جگہ پر ہے۔''

اچھا تو شاید یہ کسی بینک میں واردات کرکے آیا ہے، پولیس سے چھپتا ہوا، میں نے سوچا، مگر یہ کون سا بینک ہوسکتا ہے۔ شاید وہ جو پچھلی گلی کے نکڑ پر۔ ہاں وہی ہوگا، اس کے دروازے پر ہمیشہ ایک کاہل سا کرم خوردہ گارڈ اونگھتا ہی نظر آتا ہے، اس کی تو بندوق بھی لکڑی کی بنی لگتی ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر اسپتال کے سامنے والا بینک ہوگا جہاں شیشے کے دروازے کے پیچھے کھڑا گارڈ اپنی شاٹ گن سینے سے لگائے بینک کے دروازے پر نظر رکھنے کے بجائے سامنے کاؤنٹر پر بیٹھی گوری چٹی خزانچی لڑکی کو گھورتا رہتا ہے جو ہر وقت نوٹوں کی گڈیوں سے کھیلتی رہتی ہے، جب گارڈ ایسا بدنیت ہو تو بینک کو لوٹنا کیا مشکل ہے— میرے دل میں کئی بار یہ خیال آیا۔

''تم اکیلے کیوں رہتے ہو؟'' اجنبی نے تکیہ موڑ کے اپنے سرہانے رکھا اور بولا، ''شادی وادی کیوں نہیں کی اب تک— کھاتے کماتے تو ہو؟''

''بس کھاتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا، ''کماتا کم ہی ہوں۔ کون کرے گا مجھ سے شادی— تم میری جگہ ہوتے تو شادی کا سوچتے؟''

''کیوں نہیں سوچتا؟'' وہ چہکا، ''گھر ہوتو گھر والی ضروری ہوجاتی ہے نا۔تم نے کوئی حسینہ نہیں تاڑی اب تک؟''

میں ذرا جھینپ گیا، ''کوئی ملی ہی نہیں۔''

''کیا؟'' وہ جھلا کے بولا، ''عجب اناڑی آدمی ہو— شہر بھرا پڑا ہے— خود، تمھاری گلی میں ایک سے ایک۔''

''تعجب ہے۔'' میں نے کہا، ''تمھیں میری گلی کے بارے میں بھی سب کچھ پتا ہے۔''

''آنکھیں کس لیے ہوتی ہیں آخر— '' وہ بولا، ''تمھیں پسند ہے کوئی؟ اچھا وہ جو کونے والا گھر ہے، گلِ مہر کے پھولوں سے گھرا ہوا، اس میں جو رہتی ہے— چمکیلی سی لڑکی— سیدھے گال پر پیارا سا تل اور ہونٹ مسکراتے ہوئے۔''

اچانک ایک تیر سا میرے سینے پر لگا۔آہ کم بخت کی منحوس نظر— پھر میں نے ذرا سنبھل کے کہا، ''میں اسے نہیں جانتا۔'' حالاں کہ میں اسے خوب جانتا تھا اور کئی بار دل ہی دل میں اس سے اظہارِ عشق بھی کرچکا تھا، یہ اور بات ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیتی تھی اور اب کچھ دن پہلے سنا تھا کہ اس کی منگنی ہوگئی تھی۔

''میں جاننے کی نہیں پہچاننے کی بات کر رہا ہوں۔'' اجنبی نے مجھے پھر کریدا۔

''اس کی تو منگنی ہوگئی ہے۔'' میں نے اجنبی کا جوش کم کرنے کے لیے انکشاف کیا۔

''اوہو— '' وہ بولا، ''پھر تو اُسے اس کی سزا ملنی چاہیے، ایک گھبرو جوان محلے میں اور... کہو تو منگنی کی انگوٹھی سمیت سالی کی انگلی کاٹ کے لے آؤں۔''

کیا مزہ آئے— ایک لمحے کے لیے میرے دل میں ایک کمینی خواہش نے سر اٹھایا مگر پھر اسے سینے کے اندر دباتے ہوئے میں نے چلا کے کہا، ''تم یہ کام کرتے ہو؟''

''اور بہت کچھ کرسکتا ہوں، کہو تو شکل بگاڑ دوں۔'' وہ سنگ دلی سے بولا، ''پچھلی گلی میں جو سنہری عینک والی نازک سی سانولی لڑکی ہے، اس کا کیس بھی میرے پاس ہے۔''

''کیسا کیس؟'' میں نے وحشت زدہ ہو کے پوچھا۔

''اسے اور خوب صورت بنانا ہے، تیزاب کی چھری سے—!''

''کیا— '' میرے منہ سے چیخ نکل گئی، ''تم تیزاب پھینکو گے اس پر؟ مگر کیوں؟''

اس نے اپنے جیکٹ کی اندرونی جیب سے چمڑے کی محفوظ تھیلی میں چھپی ایک گول شیشی نکالی، ''یہ دیکھو، حسن کی چٹنی بنانے کی ترکیب۔''

''مگر تم ایسا کیوں کرو گے، کیا بگاڑا ہے اس نے تمھارا؟''

''میرا کچھ نہیں بگاڑا۔'' وہ بوتل کو احتیاط سے اپنی جیب میں چھپاتا ہوا بولا، ''مگر میں کوئی اپنے لیے تھوڑا ہی کرتا ہوں یہ سب۔''

''پھر؟''

''پھر کیا— کسی نے یہ کام سونپا ہے مجھے— میں تو...''

''اس طرح تو تم لوگوں کو قتل بھی کر سکتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''کیوں نہیں۔'' وہ لیٹے لیٹے بولا، ''بہت کیے ہیں، اس میں کیا مشکل ہے، موٹر سائیکل دوڑاؤ، ہاتھ اٹھاؤ اور پستول چلاؤ— باقی کام تو گولیاں کرتی ہیں۔''

''مگر اتنے بے گناہ لوگ جو مر جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مرنا تو سب کو ہے میرے بھائی!'' اجنبی نے فلسفیوں کی طرح جواب دیا— ''کسی کو آج، کسی کو کل— بس کچھ ناپسندیدہ لوگ کم ہو جاتے ہیں۔''

''ناپسندیدہ لوگ؟''

''ہاں— کچھ نہ کچھ ناپسندیدہ لوگ تو ہر ایک کے ہوتے ہیں۔'' وہ بولا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے کچھ ناپسندیدہ لوگوں کو یاد کرنے کی کوشش کی تو بے شمار چہرے نظروں میں گھوم گئے۔ مجھے حیرت ہوئی، میں کتنے بہت سے لوگوں سے ناخوش تھا۔

''مگر...'' میں نے کہا، ''تم کیوں مارتے ہو انھیں؟''

''میں کب مارتا ہوں— '' اجنبی نے اطمینان سے جواب دیا، ''میں تو پستول چلاتا ہوں، مارتے تو وہی لوگ ہیں۔''

''کون لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا؟'' وہ بولا، ''اور پتا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ میں جانتا ہوں، میں

جس کے لیے کام کرتا ہوں، وہ کسی اور کے لیے کام کرتا ہے۔''

''مگر وہ ہے کون؟''

''کوئی بھی ہو— مجھے کیا!'' وہ اکتا کے بولا، پھر اس نے زور کی انگڑائی لی اور بڑی بے تکلفی سے کہا، ''یار ذرا چائے تو بنانا، مگر چینی وینی بھی ہے گھر میں یا...''

''چینی؟'' میں نے لمحے بھر کو سوچا— ''نہیں، چائے تو خیر بن جائے گی۔ میں باورچی خانے میں گھسا اور جلدی سے ایک کپ چائے بنا کے لے آیا— ''یہ لو۔''

اس نے چائے کا کپ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ''باتھ روم کدھر ہے؟'' اس نے پوچھا، ''میں باتھ روم میں چائے پیوں گا۔''

اس نے اپنے بھاری جوتے باہر ہی اتار دیے۔ جوتے گرد سے اَٹے ہوئے تھے اور ان میں سے بو آ رہی تھی۔ وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے باتھ روم کی طرف بڑھا، پھر رُکا اور کہنے لگا۔ کوئی گڑبڑ مت کرنا، میری موٹر سائیکل میں بم لگا ہوا ہے، جیسے ہی میں اپنے موبائل پر بٹن دباؤں گا، وہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔'' پھر وہ باتھ روم میں گھس گیا اور دروازہ بند کرلیا۔

تھوڑی دیر بعد فلش چلنے کی آواز آئی، اس کے بعد دیر تک غسل خانے میں پانی بہتا رہا۔ بعد میں وہ چائے کا خالی کپ اٹھائے باہر نکلا۔ اس کے منہ پر ہیلمٹ اسی طرح چڑھا ہوا تھا مگر میلی جیکٹ اور قمیص اب اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ صرف اپنی کتھئی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ بالوں بھری چھاتی پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔

''بڑا مزہ آیا۔'' اس نے چائے کا خالی کپ تپائی پر رکھ دیا۔

''کس بات کا؟'' میں نے پوچھا۔

''باتھ روم میں چائے پینے کا۔'' وہ ہنس کے بولا، ''چائے بھی پی، نہا بھی لیا۔ کیا بتاؤں، صبح سے اتنی بھاگ دوڑ رہی کہ— لمبی مہم تھی۔''

''کیسی مہم؟'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جانے دو— وہ اور کہانی ہے۔'' وہ سر جھٹک کے بولا۔ پھر وہ کپڑوں کی الماری کی

طرف مڑا، ''اچھا اپنے کچھ کپڑے تو دو۔'' اس نے کہا۔

الماری میں کپڑے بکرے کی کھالوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے قمیص پہنی، پھر کالے رنگ کی ایک جیکٹ نکالی۔ وہ مجھ سے لمبا تھا اور تگڑا بھی۔ میرا خیال تھا کہ جیکٹ اس کے لیے تنگ ہوگی۔ اس نے جیکٹ پہن لی اور جیبیں ٹٹولیں، ''یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اس کی جیبیں بڑی بڑی ہیں۔'' وہ بولا۔ پھر اس نے پتلون کی جیب سے کئی چیزیں نکالیں اور تپائی پر رکھ دیں — ٹی ٹی پستول، چاقو، تیزاب کی بوتل اور دستی بم۔

''اتنی خطرناک چیزیں ساتھ لیے پھرتے ہو، تمھیں ڈر نہیں لگتا؟'' میں نے سوال کیا۔

''مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔'' وہ ہیلمٹ کے اندر ہنسا، ''ان میں سے جو چیز تمھیں پسند ہو، اپنے لیے رکھ لو — میری طرف سے تحفہ — بڑا خیال کیا تم نے میرا۔''

''نہیں۔'' میں نے گھبرا کے کہا، ''مجھے کیا ضرورت ہے بھلا؟''

''رکھ لو یار — ہوسکتا ہے کبھی ضرورت پڑ ہی جائے۔'' وہ بولا۔ میں خاموش رہا۔ اس نے چیزیں احتیاط سے دوبارہ اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں پھر کہنے لگا، ''اچھا دیکھو، میرے جانے کے بعد فوراً گھر سے باہر مت نکلنا اور کسی کو میرے بارے میں کچھ مت بتانا ورنہ...'' اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

''ورنہ؟'' میں نے سہم کے اسے دیکھا۔

''ورنہ...'' اس نے پستول کمر میں اڑس لیا، ''کچھ نہیں —!''

اس نے اپنے میلے کپڑے ایک طرف اچھال دیے اور پھر کمرے کے اس کونے میں گیا جہاں میرے جوتے رکھے تھے۔ اس نے جلدی جلدی بھورے جوگرز پہنے اور کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے ہی لمحے باہر انجن گرجا اور اس کے بعد موٹر سائیکل کے چلنے اور گیٹ کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آئیں، پھر طویل خاموشی چھا گئی۔

میں جیسے بت بنا ایک طرف کھڑا تھا۔ مجھے تعجب تھا کہ میری جیکٹ اس کے بدن پر کیسے فٹ آگئی تھی اور میرے جوتے — اس کے پاؤں بھی خاصے بڑے تھے اور میرا خیال

تھا کہ میرے جوگرز اسے بہت تکلیف دے رہے ہوں گے۔ اچانک میری نظر اس کے گھناؤنے اور بدبودار جوتوں پر پڑی جو مسہری کے پاس ہی پڑے تھے — مردہ جانوروں کی طرح — میں ان کے پاس گیا۔ پھر بے تابی سے اپنا دایاں پاؤں ایک جوتے میں ڈالا اور حیران ہوگیا — جوتا میرے پاؤں میں ایسے فٹ آگیا تھا جیسے میرا ہی ہو۔

اداکار

وہ ایک اداکار تھا اور اداکاری کرتے اس کی عمر گزری تھی۔ زندگی بھر اس نے طرح طرح کے کردار ادا کیے تھے۔ طرح طرح کے سوانگ بھرے تھے۔ سو قسم کے بھیس بدلے تھے اور نت نئے انداز اپنائے تھے۔

وہ جو روپ دھارتا اسی میں گم ہو جاتا۔ اُسے روپ بدلنے اور دوسروں کی شخصیتوں میں ڈھلنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ سڑک پر چلتے چلتے وہ اچانک کچھ سے کچھ ہو جاتا، مثلاً فٹ پاتھ کے کنارے کسی ٹھیلے والے کو کیلے اور امرود بیچتے دیکھتا تو فوراً اسے لگتا کہ ٹھیلے والا تو غائب ہے اور وہ خود اس کی جگہ کھڑا پھل بیچ رہا ہے۔ کبھی وہ کسی بوڑھے کو لنگڑاتے ہوئے سڑک پار کرتے دیکھتا اور اس کے پیچھے چل دیتا اور پھر کچھ دور جا کے اسے پتا چلتا کہ بوڑھا تو وہ خود ہے جو لنگڑاتا ہوا سڑک پار کر رہا ہے۔

کبھی یوں بھی ہوا کہ وہ بس کے اندر کنڈکٹر کو ٹکٹ بانٹتے دیکھتا رہا اور پھر خود اسی روپ میں ڈھل گیا۔ بس سے اترا ہی نہیں، مسافروں کی بھیڑ چیرتے ہوئے بس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا کے سواریوں میں ٹکٹ بانٹتا رہا۔

ہر کردار اسے اپنا اپنا سا لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹیج پر اسے کبھی کوئی کردار ادا کرتے ہوئے کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ شائقین ہمیشہ خوش ہو کے تالیاں بجاتے اور اس کی

اداکاری کی تعریف کرتے۔ اتنا اصلی، اتنا فطری— ایکٹنگ کا گمان نہیں ہوتا، مگر اسے ہمیشہ ایک الجھن سی رہتی۔ وہ بادشاہ کا کردار ادا کرتا تو اصلی بادشاہ لگتا اور بھکاری بنتا تو اس پر پیدائشی فقیر ہونے کا گمان گزرتا، مگر حقیقت میں وہ کیا تھا؟ اصل میں تو وہ بادشاہ تھا، نہ بھکاری، مگر وہ تھا کیا؟ یہی الجھن اسے ایک کے بعد ایک ہر طرح کے کرداروں کو اپنے اوپر آزمانے پر مجبور کرتی رہی۔ ساری زندگی وہ کرداروں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو تلاش کرتا رہا۔ آخر وہ ہے کون؟ پھر وہ سوچتا، شاید ہر آدمی اپنے چہرے پر کسی اور کا چہرہ چڑھائے گھوم رہا ہے۔ اس کی زندگی بھی اسی طرح گزر گئی تھی۔ اسٹیج کے اندھیرے اور اجالے میں خود کو تلاش کرتے۔ پھر ایک بار وہ اندھیرے سے اجالے میں آیا تو اس نے خود کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ ایک بڑا جذباتی اور اعصاب شکن کردار ادا کرتے ہوئے اس نے خود کو اچانک کسی اندھے کنویں میں غوطہ کھاتے دیکھا تھا۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔

اس نے آنکھ کھولی۔ سامنے اور ہی منظر تھا۔ سفید ملبوس، مشینوں کی جلتی بجھتی روشنیاں، کلائی کو ڈستے ہوئے ربر کے چمکیلے سانپ۔ اس کی آنکھوں میں دھند بھری ہوئی تھی۔

نہ جانے کتنا وقت ایسے ہی گزرا، پھر آس پاس قدموں کی چاپ بڑھ گئی۔ شاید لوگ اندر آ رہے تھے، عیادت کرنے والے۔ ملاقات کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ پرچھائیوں کا کھیل شروع ہو گیا۔ دھند کے پردے کے پیچھے سے ابھرتی شکلیں اور آوازیں۔

''مجھے پہچانا تم نے؟'' ایک مہربان آواز کی ٹہنی پر کھلا ہوا ایک چہرہ۔ ''میں ہوں محمد حسین پرائمری اسکول ٹیچر۔''

''کون—؟'' اس نے دھند میں لپٹے چہرے کو اپنی بجھتی آنکھوں سے ٹٹولا،

''ارے وہی محمد حسین ٹیچر جس کا کردار تم نے ایک ڈرامے میں ادا کیا تھا۔ اور بہت خوب کیا تھا۔ تمھیں یاد ہے نا۔ تم نے کہا تھا کہ تنخواہ بڑھوانے کے لیے ٹیچروں کی ہڑتال میں حصہ لینے اور دوسروں کو بھی احتجاج پر اُکسانے کے جرم میں مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا اور میں بڑی بہادری کے ساتھ خاموشی کے ساتھ اپنے گھر آ بیٹھا تھا تاکہ نوکری جائے تو جائے ٹیچروں کی آن نہ جائے۔ تمھاری اس تقریر پر تماش بینوں

نے خوش ہو کے زور دار تالیاں بجائی تھیں اور ڈراما ختم ہوگیا تھا۔ مگر پھر کیا ہوا تمھیں معلوم ہے۔ مجھے معافی مانگنا پڑی تھی، نوکری واپس لینے کے لیے۔ میرا پانچ سالہ بچہ گردن توڑ بخار سے مر رہا تھا اور میرے پاس اس کے علاج کے لیے پیسے نہیں تھے۔ میں کیا کرتا مگر تم نے جس ماسٹر کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، وہ تو کوئی اور تھا۔ بہت بہادر، کبھی نہ ٹوٹنے والا، مصیبت کے سامنے کبھی ہتھیار نہ ڈالنے والا۔ میں تو وہ نہیں تھا۔ تم نے تو میرا کردار بدل ڈالا تھا۔''

اس نے جواب دیا، ''مگر سنیے میں تو آپ سے کبھی نہیں ملا، میں نے آپ کو کبھی دیکھا بھی نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی اور ہو۔ کوئی اور محمد حسین ٹیچر۔ محمد حسین پرائمری اسکول ٹیچر نے افسردگی سے کہا، ''پھر وہ تو میں نہ ہوا۔ اور تم میں نہ ہوئے۔ اصل میں کون کیا ہے، کسے پتا ہے؟''

اس نے شرمندہ ہو کے اپنی آنکھیں موند لیں۔

تھوڑی دیر بعد پھر ایک آواز اس کے کان میں آئی۔ ''سنیے!'' اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک شخص اپنے ہاتھوں میں زنبور، ہتھوڑا اور پیچ کس اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر تیل اور گریس کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ وہ بولا، میں عبدالغنی موٹر مکینک ہوں سر! یاد آیا۔ آپ نے ڈراما کیا تھا، عبدالغنی موٹر مکینک تو پاگل ہے۔ اس ڈرامے میں آپ نے عبدالغنی موٹر مکینک کو پاگل ہی ثابت کیا ہے، کیوں کہ وہ چھوٹے موٹے کام کرنے کے پیسے نہیں لیتا اور مرمت کے لیے آنے والی موٹروں کو اپنی اولاد کی طرح بڑے پیار سے بناتا اور سنوارتا ہے۔ لوگ اس کے کام سے خوش رہتے ہیں اور اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں— اور— اداکار نے آنے والے شخص کی بات کاٹ کے کہا، ''اگر تم ہی عبدالغنی موٹر مکینک ہو تو تمھیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمھارا کردار اتنا اچھا پیش کیا گیا تھا۔''

''خوش—؟'' عبدالغنی موٹر مکینک نے تھوک نگل کے غصے سے کہا، ''میں تو سچ مچ میں پاگل ہو رہا ہوں۔ ایسا موٹر مکینک بھلا کہاں ملے گا جو موٹروں کو اولاد کی طرح پالے۔ جناب گھوڑا گھاس سے محبت کرے گا تو کھائے گا کیا؟ میں تو ہر کام کے پورے

بلکہ کچھ زیادہ ہی پورے پیسے لیتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ ایک کے بجائے دو پرزے بدل ڈالوں بلکہ جس پرزے کو بدلنے کی ضرورت نہ ہو اسے بھی۔ جو موٹر مکینک یہ سب نہ کرے پاگل ہی ہوگا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں مجھے ذرا اس کا پتا بتائیں۔''

اس نے کہا، ''چلو تمھیں اس کا کردار پسند نہیں آیا، کوئی بات نہیں مگر میں تو اس سے ملا تھا۔''

موٹر مکینک بولا، ''تو پھر وہ کوئی اور عبدالغنی ہوگا۔ آپ وہیں اپنی موٹر لے جائیں، براہِ کرم میرے پاس نہیں آئیں۔''

اداکار نے آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر خاموشی رہی، لیکن ذرا دیر بعد ہی ایک اور شخص سامنے آیا، ''السلام علیکم ایکٹر صاحب!'' وہ بولا، ''مجھے پہچانا۔ ارے بھئی حکیم نعمت اللہ ہوں میں۔ وہی جن کا اسٹیج پلے پورے چھ مہینے چلا تھا، تم بنے تھے حکیم نعمت اللہ۔ یاد ہے۔ میں نے جب وہ ڈراما دیکھا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نیچے بیٹھا ہوں یا اسٹیج پر ڈراما کر رہا ہوں۔ بڑا سچا بہروپ بھرا تھا تم نے میرے بھائی۔ مگر وہ جو چٹکی بھر سفوف کی بات تھی، وہ یقیناً تمھاری ذہنی اختراع رہی ہوگی۔ تم نے کہا حکیم نعمت اللہ کے دیے ہوئے ایک چٹکی سفوف سے ناراض محبوب راضی، ہر قسم کا بیمار صحت یاب اور بوڑھا کھوسٹ جوان ہوجاتا ہے۔ تمھارے اس اعلان نے تو میرا کباڑہ کردیا۔ میرے مطب پر ناراض محبوب کو منانے والے عاشقوں کی قطار لگ گئی اور سب بوڑھے خمیدہ کمر پر اپنے ارمانوں کی بوری لادے دن رات میری دکان کا چکر لگانے لگے۔ نتیجہ کیا ہوا۔ مجھے راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ اب میں تمھارے پاس بس اسی لیے آیا ہوں کہ تم ذرا اس کراماتی سفوف کی ایک چٹکی مجھے بھی عطا کرو تاکہ میرا بگڑا ہوا کام بن سکے۔''

اداکار نے گھبرا کے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا اور جب تھوڑی دیر بعد ادھر دیکھا تو حکیم نعمت اللہ جاچکے تھے۔ البتہ ایک شخص کرتے شلوار اور سیاہ واسکٹ میں سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے سیدھے ہاتھ میں مائیکروفون اٹھا رکھا تھا۔ پھر اس نے مائیکروفون الٹے ہاتھ میں تھام لیا اور سیدھا ہاتھ اوپر اٹھایا اور ایسے بولا جیسے کسی بڑے مجمع سے خطاب کر رہا

ہو۔" ہاں ہاں میں لیڈر ہوں۔ تم نے اپنے ڈراموں میں اتنی بار میرا کردار کیا ہے کہ خود اچھے خاصے لیڈر بن گئے ہو۔ تم نے سب کو بتا دیا کہ میں دفتر میں کیسے رہتا ہوں اور گھر میں کیسے۔ ٹی وی اور اخبار والوں سے کیسے بات کرتا ہوں۔ اور پارٹی ورکروں سے کیسے۔ میرے کتنے چہرے اور کتنے روپ ہیں۔ کتنی آوازیں اور کتنے لہجے۔ یہ سب تم نے لوگوں کو بتایا۔ مجھے اس بات پر اعتراض ہے کہ تم نے اپنی کوششوں سے مجھے لیڈر کے بجائے ایک اداکار ثابت کیا ہے۔ یاد رکھو اداکار تم ہو اور تم ہمیشہ اداکار ہی رہو گے۔ لیڈر کبھی نہیں بن سکتے!"

اس نے لیڈر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں پھر دھندلانے لگی تھیں اور شریانوں میں سردی کی لہر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے لال کمبل کو ذرا سا اوپر کھینچا اور تکیے میں منہ چھپا لیا مگر پھر جیسے کسی نے پاس میں سسکی بھری۔ اس نے گھبرا کے سامنے دیکھا۔ اس کے بیڈ کے پاس ہی ایک نوجوان کھڑا تھا جس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور اس کے پتلون اور قمیص میں بے شمار سلوٹیں تھیں۔ اس کی آنکھیں جیسے رونے سے لال ہو رہی تھیں۔

"میں بابو نذیر ہوں جناب!" وہ گلوگیر آواز میں بولا، "ریلوے کلرک، آپ نے پہچانا۔ آپ بابو نذیر بنے تھے ایک ڈرامے میں، ارے وہی جس کی بیوی گیس کا چولھا پھٹنے سے جل کے مر گئی تھی۔ کیسا روتا دھوتا رول کیا تھا آپ نے بابو نذیر کا، سارے ہال کی ہمدردیاں آپ نے بابو نذیر کے لیے جیت لی تھیں۔ اپنی بیوی سے ٹوٹ کے محبت کرنے والے اس شخص کے لیے جو اس کے بچھڑنے کے غم میں پاگل سا ہو رہا تھا۔ ڈراما دیکھنے والی عورتوں کے دلوں پر ایسی دھاک بیٹھ گئی تھی کہ ان سے نہ جانے کتنی اس کا غم غلط کرنے کے لیے زندگی بھر کے لیے اس کا ساتھ نبھانے کو تیار تھیں۔ مگر جناب میں اپنے ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کے آج ایک بات آپ سے کہنے آیا ہوں۔ آپ کا کردار نامکمل تھا۔ آپ نے بابو نذیر کا صرف ایک ہی رخ لوگوں کو دکھایا، اصل بات کا تو کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ میں بتاؤں بابو نذیر کی بیوی گیس کا چولھا پھٹنے سے نہیں مری تھی، اسے بابو نذیر نے یعنی میں نے خود اپنے ہاتھوں سے جلایا تھا۔ بیوی خوب صورت اور خاوند شکی ہو تو ایسا ہوتا

ہے۔ میں اپنا جرم مانتا ہوں مگر مجرم تو آپ بھی ہیں، آپ نے پورے بابو نذیر کو کیوں لوگوں کے سامنے پیش نہیں کیا؟''

اس نے سوچا کہ بابو نذیر سے کہے کہ کردار تو پرچھائیں کی طرح ہوتے ہیں جو دن کی روشنی کے ساتھ گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں، کون انھیں پوری طرح گرفت میں لاسکتا ہے۔ مگر جب اس نے سامنے دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ بیڈ کے پائینتی لگا ہوا پردہ سبز غبار کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھیل گیا۔ نہ جانے کب تک وہ ہونے یا نہ ہونے کے درمیان معلق رہا۔ اندھیرے اور اجالے کے درمیان — وقت دھندلا گیا تھا۔

پھر کسی نے اُسے پکارا۔

''کون؟''

''میں ہوں؟''

''میں کون؟''

''ارے آنکھیں تو کھولو۔''

اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لڑکی کھڑی تھیں۔ سوال کرتی آنکھیں، سرگوشیاں کرتے ہونٹ، اُجالا بکھیرتی پیشانی۔''

''میں جمیلہ ہوں۔ تمھارے ڈرامے کی ہیروئن۔ تم نے اس ڈرامے میں میرے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ میں تمھاری بیوی بنی تھی۔ یاد ہے۔ مگر ڈرامے میں جو بیوی ہوتی ہے، وہ بیوی نہیں ہوتی۔ اور جو شوہر ہوتا ہے، وہ شوہر نہیں ہوتا۔ مگر ہم دونوں نے میاں بیوی کی کیسی کامیاب اداکاری کی تھی۔ آئیڈیل جوڑا — ہم جس سین میں اکٹھے ہوتے، ہال میں تالیاں بج جاتیں مگر پھر وہ ڈراما عجب طریقے سے ختم ہوا۔ تم نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ اپنے دل سے بھی۔ کیوں کہ میں ماں نہیں بن سکی تھی۔ مگر کتنا بڑا جھوٹ تھا وہ، تم جانتے ہو یا شاید نہیں جانتے۔ حالاں کہ تمھیں جاننا چاہیے۔ سنو، میں تمھیں بتاتی ہوں۔ میں ماں بننے والی تھی، سچ مچ۔''

اچانک اداکار کے سینے میں زور کی ایک ٹیس اٹھی۔ اس نے ہڑبڑا کر ہاتھ چلایا

اور میز پر رکھا شیشے کا گلاس نیچے گر کے ٹوٹ گیا۔ فرش پر پانی پھیل گیا۔

نرسیں دوڑی ہوئی اندر آئیں۔ انھوں نے بستر کی طرف دیکھا۔ اداکار کی زندگی کا ڈراپ سین ہو چکا تھا اور برقی مشینوں میں قلب کی دھڑکنیں گننے والی روشنی کی لکیر ساکت ہو چکی تھی۔ اداکار کے بستر کے پاس بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور اس کی موت پر افسوس کرنے لگے۔ پھر کسی نے کہا، ''لگتا ہے جیسے مرا نہیں، اداکاری کر رہا ہے!''

آدمی اور جانور

خبر آئی تھی کہ دارالحکومت سے کچھ دور واقع ایک بستی کی آبادی میں اچانک تیزی سے اضافہ ہونے لگا تھا۔ جانور انسان بننے لگے تھے اور اب وہاں ایک تحقیقاتی ٹیم بھیجی گئی تھی کہ حالات کا جائزہ لے کر تفصیلی رپورٹ حکومت کو بھیجی جائے۔ تحقیقاتی ٹیم کے سربراہ عہدے کے علاوہ جثّے کے اعتبار سے بھی بھاری بھرکم افسر تھے اور ان کے ساتھ دو ارکان تھے جن میں ایک خاتون بھی شامل تھیں۔ خاتون بڑی دبلی اور منحنی سی تھیں اور انھیں زمین پر اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے ہمیشہ بھاری جوتے پہننے پڑتے تھے اور ان کی آواز بھی کم زور تھی۔ لہٰذا جب وہ بات کرتیں تو انھیں اپنی آواز دوسروں تک پہنچانے کے لیے خاصا زور لگانا پڑتا جس کی وجہ سے ان کی زبان منہ سے باہر نکل آتی۔ تیسرے رکن اپنے آپ میں مگن ایک صاحب تھے مگر نرم گفتار اور خوش پوش۔

جیپ سے اتر کر وہ تینوں جیسے ہی سرکاری ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں داخل ہوئے، ہر طرف ہلچل سی مچ گئی اور آس پاس کے گھروں سے لوگ ان کے پاس ایسے آنا شروع ہو گئے جیسے رویتِ ہلال کمیٹی کے سامنے چاند نظر آنے کی گواہی دینے آئے ہوں۔

بڑے صاحب نے ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں موجود لکڑی کی بدرنگ میز پر اپنا دفتر سجا دیا اور ان کے دونوں ساتھی ان کے دونوں طرف مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔

بڑے صاحب نے میز کے نیچے پاؤں پھیلا کر سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لیا اور مہمان خانے کے چوکی دار سے جو سامنے کھڑا انگوچھے سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا، پوچھا، ''ہاں تو کیا قصہ ہے، کس نے یہ گپ اڑائی ہے؟''

چوکیدار بولا، ''گپ نہیں سر! یہ سچ ہے، ایس ایچ او صاحب سے پوچھ لیں آپ، وہ بھی بس آنے والے ہیں۔ پرسوں فیکا تانگے والا گھوڑے کو تانگے میں جوت رہا تھا کہ نجانے کیا ہوا، اچانک گھوڑے نے لگام وگام توڑ تاڑ ایک دم دوڑ لگا دی۔ کوچوان فیکا اِدھر اُدھر اسے ڈھونڈتا رہا، کچھ پتا نہیں چلا۔ پھر کل ایک آدمی لمبے منہ والا اس کے گھر آیا اور بولا، 'میں تمھارا گھوڑا ہوں، اب آدمی بن گیا ہوں۔ گھوڑے کے جون میں بہت مشقت کی میں نے، اب میں دوسروں پر سواری گانٹھوں گا۔ خدا حافظ' یہ کہہ کر وہ چل دیا اور فیکا بس دیکھتا رہ گیا۔''

چوکیدار چپ ہوا تو ایک بڈھا کسان آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ کے کہنے لگا، ''صاب جی، میرے پاس ایک سانڈ تھا، بڑا جی دار، اس کے ماتھے پر یہ بڑا کالا سا خم دار نشان تھا، بالکل پہلی کے چاند کے جیسا، وہ سب گایوں کے کام آوے تھا، لوگ اسے مانگ مانگ کر انھیں گابھن کرانے کو لے جاویں تھے۔ پر نجانے سسرے کو کیا ہوا۔ اچانک ایک دن جو پلٹ کے آیا تو اس کی آنکھوں میں عجب رنگ تھا۔ رات بھر چھپر تلے بیٹھا جگالی کرتا رہا۔ صبح سویرے جو میری آنکھ کھلی تو غائب۔ کچھ دن ہوئے کریما میرے پاس آیا، ارے وہی اپنا گایوں بھینسوں کا چرواہا، بڑا پریشان تھا بے چارہ۔ بولا، 'کوئی گورا چٹا گھبرو جوان اس کی گھر والی کے پیچھے پڑ گیا ہے، یہاں کا تو لگتا نہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کی پیشانی پر کالے رنگ کا چاند — میں نے کریما سے تو کچھ کہا نہیں مگر سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو وہ اپنا... لچا کہیں کا —''

پھر ایک عورت آگے بڑھی اور بولی، ''مائی باپ میرا سوہنا مجھے واپس دلاؤ، بڑی منتوں مرادوں والا ہے، قلندر شاہ کے مزار پر گئی تھی، تب ملا تھا!''

''کون تمھارا بیٹا؟'' خاتون افسر نے پوچھا۔

''نا جی نا،'' عورت بولی، ''مینڈھا تھا اپنا۔ برف جیسے سفید اونی بال اور بالکل لمبردار کی مونچھوں کی طرح غرور سے اکڑی ہوئی کالی سینگیں۔''

''تو ہوا کیا اسے؟'' صاحب نے پوچھا، ''کسی نے قربانی وربانی کردی اس کی؟''

''خدا نہ کرے۔'' عورت برا مان گئی، ''مل گیا تو میں خود کروں گی اس کی قربانی۔ پر ملے تو نا۔ دو تین ہفتے سے لاپتا ہے۔ میرے خاوند کا دوست ہے، نواز دین لوہار۔ وہ بولتا ہے، اس نے اسے دیکھا ہے پڑوس کے گاؤں کے اندر کڑوے شاہ کے میلے میں۔ نواز دین نے اسے لومڑی کے بدن والی لڑکی کے تماشے میں ٹکٹ بیچتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہائے ہائے میرا سوہنا مینڈھا۔ خوامخواہ میں کیوں آدمی بن گیا۔''

صاحب نے ڈپٹ کے کہا، ''کیا بکواس کرتے ہو تم لوگ۔ ایسا بھی کبھی ہوا ہے؟''

''کیوں نہیں ہوا۔'' ایک اسکول ماسٹر نے آگے بڑھ کے کہا، ''سر! میرا تجربہ کہتا ہے۔ یہ جو میرے اسکول میں زیادہ تر لڑکے پڑھتے ہیں، کسی میں ذرا سی لیاقت نہیں۔ لگتا ہے سب کے سب گدھے ہیں۔ اب ان کے ماں باپ سے پوچھا جائے تو پتا چلے، وگرنہ—''

''کچھ شرم کرو۔'' خاتون افسر نے چلّا کے کہا اور زبان لہرائی، ''ماؤں پر تہمت، توبہ توبہ—''

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی کہ اچانک علاقے کے تھانے دار صاحب مع اپنے پرچہ نویس کے وہاں آپہنچے۔ ''آؤ جی آؤ۔'' کئی لوگوں نے خوش ہو کے انھیں راستہ دیا۔

''ہمارے ایس ایچ او صاحب آگئے ہیں جی۔'' کسی نے صاحب کو مخاطب کیا، ''اب یہ بتائیں گے کہ روز اتنے سارے حادثات ہو رہے ہیں یہاں!''

''حادثات!'' صاحب کو اس لفظ پر اعتراض تھا۔

''چلیے واقعات کہہ لیجیے۔'' کسی نے جواب دیا، ''تھانے والوں کو تو پتا ہے۔''

ایس ایچ او صاحب نے آگے بڑھ کے افسرِ اعلیٰ کو بڑا سا سلام ارسال کیا۔

''آیئے آیئے۔'' صاحب خوش دلی سے بولے، ''بیٹھیے۔'' انھوں نے تھانے دار

یَن طرف ایک مونڈھا سرکایا جو اب تک خالی پڑا تھا۔

''ہاں تو۔'' صاحب نے بات شروع کی۔ میں یہ کیا داستانِ طلسمِ ہوش رُبا سن رہا ہوں یہاں۔ جانور آدمی بنتے جا رہے ہیں، آپ یقین کرتے ہیں ایسی خرافات پر؟''

ایس ایچ او نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا، اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھر اس کے بعد صاحب کے قریب جھک کر جیسے انھیں اعتماد میں لیتے ہوئے کہا، ''یقین تو نہیں آتا مگر ایسے واقعات ہو رہے ہیں سر!''

''مائی فٹ!'' صاحب گرجے، ''تو آپ بھی...؟''

''بات یہ ہے سر!'' ایس ایچ او نے اپنے ہوش حواس مجتمع کر کے کہنا شروع کیا، ''تھانے میں سارا ریکارڈ موجود ہے جن جن لوگوں نے اپنے جانوروں کے بارے میں تھانے میں رپورٹ لکھوائی ہے ان کے نام اور پتے میں آپ کو دے سکتا ہوں۔ آپ چاہیں تو ان سب سے مل بھی سکتے ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارا ریکارڈ آپ کے پاس موجود ہے۔ سارے اعداد وشمار۔'' پہلی بار تفتیشی ٹیم کے تیسرے رکن نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اپنے بالوں کو سنوار اور ٹائی کی گرہ ٹھیک کی۔

''میرے بھائی! آپ تو ٹھہرے حساب داں۔'' بڑے صاحب ان سے مخاطب ہوئے، ''آپ فوراً ہندسوں پر جائیں گے، کتنے جانور غائب ہیں، کتنے آدمی ان کی جگہ لینے آگئے ہیں۔ مگر یہ صرف اعداد و شمار کا کھیل نہیں ہے، اس میں دیکھنا پڑے گا کہ پہلے کبھی ایسے واقعات یہاں ہوئے ہیں یا نہیں۔ اگر پہلے نہیں ہوئے تو اب کیوں ہو رہے ہیں۔ اور اب ہو رہے ہیں تو ان کے اثرات اس بستی پر کیا ہوں گے؟''

پتلی عورت نے اپنی نوکیلی زبان پھر منہ سے باہر نکالی اور بولی، ''پہلے شہادتیں تو مکمل ہونے دیجیے۔ ایس ایچ او صاحب کے تھانے کا ریکارڈ دیکھنا ہی پڑے گا۔ کیوں صاحب، اب تک کتنے جانوروں کے غائب ہونے کی رپٹ لکھوائی گئی ہے؟''

ایس ایچ او صاحب نے اپنے ہاتھ میں تھمے ہوئے رجسٹر پر نگاہ دوڑائی اور کہا،

''سر کل رات تک صرف اس گاؤں سے تین بھینسوں، دو کتوں اور ایک اونٹ بلکہ ایک بندر کے بارے میں بھی اطلاع ملی ہے کہ...'' وہ چپ ہوگیا۔

''چپ کیوں ہوگئے؟'' صاحب نے مسکرا کے پوچھا، ''یہ کہو نا کہ وہ سب آدمی بن گئے ہیں۔ دماغ خراب ہوگیا ہے۔''

''کس کا، جانوروں کا؟'' کسی نے پوچھا۔

''جانوروں کا نہیں ہم جیسے آدمیوں کا۔'' صاحب نے تڑخ کے جواب دیا۔

''کچھ بھی ہو صاحب مجھے تو اپنا بندر چاہیے۔'' ایک آدمی نے جو ایک ہاتھ میں ڈگڈگی اور دوسرے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی لیے ہوئے تھا، آگے بڑھ کے کہا۔

''تم کون ہو میاں؟'' صاحب نے سوال کیا۔

''میں بندر والا ہوں جناب۔ گلی گلی پھر کے بندر کا تماشا دکھاتا تھا مگر— میرا بندر گیا تو پرانا تماشا ختم، نیا تماشا شروع!''

پتلی عورت نے پوچھا، ''مگر تمھارا بندر ہے کہاں؟''

بندر والے نے کہا، ''مجھے تو لگتا ہے میرا بندر بھی افسر بن گیا ہے صاحب۔ بڑا شوق تھا اسے جنٹلمین بننے کا۔'' اس نے پلٹ کے سوٹ بوٹ والے افسر کی طرف دیکھا۔ کچھ لوگ ہنس پڑے۔

صاحب نے زور سے اسے گھڑکا اور تھانے دار سے پوچھا، ''بندر کے علاوہ لسٹ میں اور کون سا جانور ہے؟''

تھانے دار بولا، ''باقی ابھی لسٹ سے باہر ہیں سر جی۔ ابھی ان کی نوبت نہیں آئی، ہر قسم کے ڈھور ڈنگر یہاں پائے جاتے ہیں۔''

اسی وقت ایک کالے رنگ کی پجیرو آ کے رکی اور اس میں سے دو بندوق بردار پگڑ باز اترے۔ ان کے پیچھے چھوٹے قد کا ایک منحنی سا آدمی منہ پر دو گز لمبی مونچھیں سجائے احاطے میں داخل ہوا۔ لوگوں نے احترام سے اسے آگے آنے کا راستہ دیا۔

تھانے دار صاحب نے بھی فوراً اپنا مونڈھا خالی کردیا اور بڑی گرم جوشی سے

آنے والے شخص کا استقبال کیا۔ ''یہ ہیں ہمارے چودھری خیر دین۔ اس گاؤں کے سب سے بڑے زمیں دار۔'' تھانے دار نے بڑے صاحب سے اس کا تعارف کرایا، ''یہ تو آپ کو خود بتائیں گے۔ ان کے دو بڑے کتے دغا دے گئے ہیں۔ کسی نے آ کے بتایا ہے دونوں نہر کے پل پر آدمی بنے کھڑے تھے اور خوامخواہ بھونک رہے تھے، میرا مطلب ہے چودھری صاحب کو گالیاں نکال رہے تھے۔''

''او جی زمانہ ہی خراب ہے۔'' چودھری صاحب نے آگے بڑھ کے صاحب سے مصافحہ کیا۔ ''دن رات پاؤں میں لوٹتے تھے، شکار پر ساتھ جاتے تھے، راتوں رات آدمی بن گئے سالے، کسی کام کے نہیں رہے۔ مگر میں انھیں چھوڑوں گا نہیں۔''

صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہیں۔ صرف مسکرا کے رہ گئے۔

چودھری نے کہا، ''اچھا کیا آپ لوگ آگئے مگر اس بھوت بنگلے میں رہیں گے آپ؟ یہاں تو پینے کو پانی بھی نہیں ملے گا آپ لوگوں کو۔ نہیں سرکار آپ میرے مہمان ہیں آپ لوگوں کے ٹھہرنے کا انتظام بھی میری حویلی پر ہوگا۔''

پھر اس نے اپنے محافظوں کو آواز دی، ''صاحب لوگوں کا سامان حویلی پہنچواؤ۔ وہ فقیرا کدھر ہے، اسے بلاؤ فوراً۔ دیکھنا، کہیں اس کا خچر بھی تو بھاگ نہیں گیا، کچھ اعتبار نہیں۔ اب تو جو جانور ہے وہ آدمی بننا چاہتا ہے۔ کام چوری کی بھی حد ہے۔''

صاحب نے کسمسا کے پہلو بدلا اور چودھری سے کہا، ''میرا خیال ہے ہم لوگ یہیں ٹھیک ہیں، آپ کو تکلیف ہوگی اور پھر یہاں دوسرے گاؤں کے لوگ بھی اپنی شکایتیں لے کر آ رہے ہیں، اس لیے——''

چودھری صاحب نے کہا، ''چلیے آپ کی مرضی۔ مگر کھانا تو میری طرف سے ہی آئے گا۔ تھانے دار جی آپ بھی یہیں روٹی کھانا!'' اس نے ایس ایچ او کے شانے کو چھوا۔

''بہتر چودھری صاحب!'' ایس ایچ او نے ممنونیت سے کہا اور جھک کے اس کے گھٹنے چھوئے۔

چودھری مہمانوں سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوئے تو بیانات دوبارہ شروع

ہوئے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کے کہنا شروع کیا، ''آپ بتا سکتے ہیں حکومت ہمارے جانوروں کو واپس لانے کے لیے کیا کر رہی ہے؟''

''یعنی کیا مطلب۔'' پتلی عورت نے مسکرا کے پوچھا، ''انھیں آدمی سے دوبارہ جانور بنانے کے لیے — ویسے حکومت کیا کرسکتی ہے؟''

''کیوں نہیں کرسکتی —'' کوئی بولا، ''قانون بنا سکتی ہے کہ جانوروں کے آدمی بننے کی ممانعت ہے۔''

صاحب نے اکتا کے کہا، ''یہ بڑی بیوقوفی کی بات ہے۔ بھلا حکومت یہ سب کیسے کرسکتی ہے۔ کبھی ایسا پہلے بھی ہوا ہے؟''

''کیوں نہیں ہوا ہے۔'' خوش پوشاک افسر بیچ میں بول پڑا۔ ''میں آپ کو سیکڑوں بیوقوفی کے قانون گنوا سکتا ہوں جو حکومت نے بنائے ہیں۔''

''اچھا قانون کی بات چھوڑو۔'' صاحب نے زچ ہوکر کہا، ''ان لوگوں کو کیسے قائل کیا جائے کہ جانور کبھی آدمی نہیں بن سکتے۔ انھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ انھیں چاہیے کہ اپنے جانوروں کو یہیں کہیں تلاش کریں۔ مجھے تو لگتا ہے یہ کوئی خاص گروہ ہے جو کسی خاص مقصد کے لیے جانوروں کو غائب کر رہا ہے۔''

ایس ایچ او نے کچھ کہنا چاہا مگر اسی وقت مہمان خانے کے احاطے میں بہت سے لوگ گھس آئے۔ یہ سب لوگ قریبی بستیوں سے آئے تھے۔ انھی میں سے ایک آدمی جو سر پر لال چار خانے والا رومال باندھے ہوا تھا، آگے آیا، ''ہمارے گاؤں میں بھی کئی جانور — سر جی میں ان لوگوں کو ساتھ لایا ہوں جو کہتے ہیں کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک بھینس گھاس چرتے ہوئے نہر کے قریب ایک درخت کے پیچھے گئی مگر جب دیر تک واپس نہیں آئی تو انھوں نے وہاں جا کے اسے تلاش کیا مگر سر وہاں انھیں بھینس کی جگہ موٹی سی دھوبن ملی جو نہر کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔ اب بتائیں کہ بھینس کا مالک کیا کرے۔ اس کا تو نقصان ہوگیا نا۔ وہ بستی کے گھروں میں دودھ فروخت کرتا ہے۔ وہ اس موٹی دھوبن کا کیا کرے؟''

پھر اور بہت سے لوگ اپنے اپنے نقصانات گنوانے لگے۔ بکرا، گائے کا بچھڑا، اکلوتا مرغا، سیاہ بطخ، بولتا توتا۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کے تفتیشی ٹیم کے سربراہ سے ہاتھ ملایا، ''میں ایک مضافاتی اخبار 'سچی افواہ' کا مدیرِ اعلیٰ ہوں سر! اس بار تو ہماری شہ سرخی یہی ہوگی کہ جانوروں میں انسان بننے کا رجحان شدت پکڑ گیا۔ جانور بھی اپنی ایمان دارانہ زندگی سے اکتا گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا بیان بھی چھاپوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان 'نو انسانوں' کو کب تک خصوصی شناختی کارڈ جاری کیے جائیں گے؟''

صاحب کو اتنی عقل مندی کی باتیں کرنے والے صحافی کی بات سن کے بڑا غصہ آیا اور انھوں نے سوچا کہ حضرت سے پوچھیں کہ وہ الو سے انسان کب بنے مگر پھر اس خیال سے چپ ہوگئے کہ دیگر فریادی ان کے پیچھے پڑ جائیں گے کہ وہ آدمیوں کے روپ میں دوسرے جانوروں کو بھی پہچانیں۔

خیر انھوں نے کمالِ ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے کاغذات اٹھائے اور اعلان کیا کہ انھوں نے لوگوں کے بیانات پر مشتمل ایک سیر حاصل رپورٹ مرتب کرلی ہے اور اب وہ اپنے ساتھیوں کی آرا کی روشنی میں کچھ سفارشات متعلقہ سرکاری اداروں تک پہنچائیں گے تاکہ اس معاملے میں مناسب فیصلے کیے جاسکیں۔

مگر صاحب کی تقریر سے احاطے میں جمع ہونے والے لوگوں کی تسلی نہیں ہوسکی اور وہاں کچھ دیر میں اتنا بڑا ہجوم اکٹھا ہوگیا کہ تفتیشی ٹیم کے لیے لوگوں سے مزید گفتگو کرنا ناممکن ہوگیا۔ ایس ایچ او نے ایک بار باہر جا کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ بپھرے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت فوری طور پر کھوئے ہوئے جانوروں کا پتا چلائے۔ مضافاتی اخبار کے ایڈیٹر کا مطالبہ تھا کہ حکومت کی جانب سے عوام کو بتایا جائے کہ چڑیا گھروں کو کیوں ختم کیا جارہا ہے اور جب سے پہاڑی جنگلوں کا مونڈن شروع ہوا ہے، وہاں کے تیندوے، شیر اور دوسرے خوں خوار درندے کہاں جا رہے ہیں اور شہروں میں خون کے دھبے کیوں بڑھتے جا رہے ہیں؟

تھانے دار نے اندر جا کے افسرِ اعلیٰ کو بتایا کہ لوگوں کا موڈ بہت خراب ہے اور وہ جانوروں کی تلاش میں دارالحکومت پر دھاوا بولنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ صاحب نے اپنی ٹیم سے مشورہ کیا۔ پتلی عورت پہلے ہی بہت ڈر گئی تھی اور خوش پوشاک افسر نے اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر لی تھی مگر پھر بھی اس گردن کا پھندا کسا ہوا رہا تھا۔ انھوں نے فوراً کوچ کا فیصلہ کیا اور جیپ میں سوار ہو گئے۔ انھیں محفوظ راستہ دینے کے لیے تھانے دار کو ہجوم پر ہلکا سا لاٹھی چارج کرنا پڑا۔

جب ان کی گاڑی علاقے کی حدود سے نکل گئی تو صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا، ''بڑا خراب دن تھا۔ سب کے سب جانور تھے۔'' پتلی عورت ہنسی اور اس کی زبان منہ سے باہر نکل آئی، ''تھانے دار کو دیکھا تھا چودھری کے سامنے کیسا جھک گیا تھا جیسے اس کے جوتے چاٹنا چاہتا ہو، بالکل کسی کتے کی طرح۔''

''اور چودھری اور اس کی مونچھیں،'' خوش پوشاک افسر بولا، ''لگتا تھا جیسے کالے بلے نے منہ میں چمگادڑ دبا رکھی ہو۔'' اور وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

دوسری طرف تھانے دار لوگوں کو سمجھا رہا تھا، ''جانوروں کو ڈھونڈنا مشکل نہیں، اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ وہ تمھیں آس پاس ہی ملیں گے۔''

پھر کوئی بولا، دیکھا نہیں، وہ بڑے سر والا تو بالکل ہاتھی تھا ہاتھی اور دوسرا خرگوش کا بھائی۔ اور وہ عورت — کسی نے فقرہ کسا، ''بالکل چھپکلی تھی سالی، توبہ کتنی لمبی زبان تھی اس کی!'' اور سب ہنس پڑے۔

رِپ وان ونکل کی ڈائری

جب سے میں واپس آیا ہوں اپنے شہر کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لوگ، راستے، عمارتیں، پیڑ پودے، بجلی کے کھمبے—

مجھے اپنے گھر کی تلاش ہے۔ روز صبح اس کی تلاش میں نکلتا ہوں اور دن بھر کی آوارہ گردی کے بعد تھک ہار کے شام کو بڑھیا کے مہمان خانے میں واپس آجاتا ہوں جہاں میرا بستر ہے۔

میں نے کئی دروازوں پر دستک دی۔ اندر سے لوگ بھی باہر نکلے مگر ان کی آنکھیں کانچ کی بنی ہوئی تھیں، پھر جب میں آج جیبوں میں کانچ کی گولیاں بھر کے واپس لوٹا اور بڑھیا کے مہمان خانے کی چوکھٹ پر بیٹھ کے پاؤں کے کانٹے نکالنے لگا تو اس نے کہا، ''لاؤ میں تمھارے پاؤں صاف کردوں، لگتا ہے تم ہر وقت چلتے رہتے ہو، سوتے میں بھی۔''

میں نے کہا، ''مجھے اپنا گھر نہیں ملتا۔ وہاں میری بیوی رہتی تھی اور میرا بیٹا۔'' یہ سن کے ایک ادھیڑ عمر کا بھاری بھرکم شخص جس کا آدھا سر بالوں سے محروم تھا، آگے بڑھا۔ اس کا منہ کسی ان جانی حیرت سے انگریزی کے حرف او کی طرح کھُلا ہوا تھا۔ وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بولا، ''میں ہوں آپ کا بیٹا۔''

میں نے کہا، ''تم مہمان خانے کی مالکہ کے بیٹے ہو، جانتا ہوں مگر میں اپنے

بیٹے کی بات کررہاہوں۔کل جب میں یہاں سے گیا تھا تو وہ دس سال کا تھا، چھوٹا سا۔''

''تو میں جو ہوں۔'' ایک بچے نے آگے بڑھ کے کہا، ''میں آپ کا پوتا ہوں دادو! آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھ لیں۔''

میں مسکرایا، ''تم بہت اچھے بچے ہو تمھیں پتا ہے بڑوں کا دل کیسے رکھتے ہیں۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست بن سکتے ہیں۔''

سمندر پکارتا ہے

کئی دن سے مجھے سوتے میں دور کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ شاید بہت سے لوگ پکار رہے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے کان زمین پر لگائے تو احساس ہوا کہ یہ تو سمندر کی لہروں کی آواز ہے۔ شاید سمندر مجھے پکار رہا تھا— پرانا سمندر۔ تو آج میں اس کی تلاش میں نکلا۔ پیدل چلتے چلتے تھک گیا تو اس بس میں سوار ہوگیا جو سمندر کی سمت جاتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ سمندر ویسا ہی ہوگا۔ وہ مجھے پہچان لے گا اور اس کی مہربان لہروں سے لپٹ کے میں سارے گلے اور شکوے اس کے حوالے کرسکوں گا اور خود ہلکا پھلکا ہوجاؤں گا۔ مگر بس چلتی رہی اور عمارتیں لپک لپک کے میرا راستہ کاٹتی رہیں۔ میں عمارتوں کے اس پتھریلے جال میں ایسا الجھا کہ سمندر تک پہنچنا مشکل ہوگیا۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ سمندر تک پہنچنے کا سب سے آسان راستہ کون سا ہے؟ پھر ایک شخص میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے ایک بڑی سی دکان پر لے گیا جہاں سمندر قید تھا۔ اس کی آسمان کو چھوتی ہوئی نیلی نیلی لہریں مٹیالی دیواروں پر چھائی ہوئی تھیں۔ اس سے اچھا سمندر آپ کو کہیں نہیں مل سکتا، بالکل پولیوشن فری (pollution free)! وہ مسکرا کے بولا، ''اب سمندر کو سنہرے چوکھٹوں میں محفوظ کرلیا گیا ہے۔''

لنگر جاری ہے

میں جس مہمان خانے میں رہتا ہوں وہاں مجھے کھانا دینے کا کام جس بڑھیا

کے سپرد ہے، وہ ہر بار کھانا دیتے ہوئے ناک بھوں چڑھاتی ہے اور کہتی ہے، ''کیا تم صرف کھانا کھانے واپس آئے ہو۔ کچھ کام کاج بھی کرو۔ گھر میں مت بیٹھے رہو۔ اپنے لیے کوئی نوکری ڈھونڈو، بڑی ڈینگیں مارتے ہو کہ بڑے بڑے طرّم خان تمھارے دوست ہیں۔ کوئی ہر وقت سر پر بائیس گریڈ کا فولادی خود ڈاٹے رکھتا ہے تو کوئی اپنے جوتے کو سونے کے تسموں سے باندھتا ہے۔ جاؤ ان سے مدد لونا۔ خیراتی لنگر کب تک چلے گا۔'' تو آج اپنے ایک دوست سے ملنے گیا جس کے پاس الہ دین کا چراغ ہے اور جو لوگوں کے بگڑے نصیب سنوارتا ہے۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا، ''ارے تم اب تک زندہ ہو میرے دوست۔ اتنے دن کہاں رہے۔ میں تو سمجھا ڈینگی بخار کے ہتھے چڑھ گئے، بولو کیسے آنا ہوا، الیکشن لڑنے کے لیے ٹکٹ چاہیے یا کہیں کسی سرکاری پلاٹ پر قبضہ کرانا ہے۔ مانگو کیا مانگتے ہو، بس نوکری کا سوال نہ کرنا۔ آج کل بچت کا زور ہے۔ ہر کمپنی اخراجات کم کرنے کے لیے اپنے اسٹاف سے مدد لے رہی ہے، انھیں رخصت کر کے۔''

ظاہر ہے کہ یہ بات اتنی تسلی بخش تھی کہ میرے لیے وہاں مزید ٹھہرنا یا کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی لنگر شروع ہونے کا وقت آ رہا تھا۔

آدمی کو پہچانو

آج ایک عجب واقعہ پیش آیا۔ میں ایک جگہ کھڑا تھا کہ دیکھا ایک آدمی دور سے مجھے گھور رہا ہے۔ میں اس کے پاس گیا۔ وہ بولا، ''تم نہ آتے تو شاید میں تمھارے پاس آ جاتا۔''

میں نے کہا، ''مگر میں تو تمھیں نہیں جانتا۔''

وہ بولا، ''میں کون سا تمھیں پہچانتا ہوں، کبھی دیکھا بھی نہیں۔''

''تو ـــ؟'' میں نے حیران ہو کے اسے دیکھا۔

''تو کیا؟'' وہ بولا، ''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ مجھے ایک چڑیا گھر میں لے گیا۔ اندر کٹھروں میں بہت سے جانور بند تھے۔ وہ ایک کٹھرے کے پاس گیا۔ اس میں ایک

بندر اچھل کود کر رہا تھا۔ میرے ساتھی نے پوچھا، ''اسے پہچانتے ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا، ''بندر ہے۔''

وہ بولا، ''دیکھا، بندر نہیں بدلا، جب دیکھو بندر مگر آدمی بدل گیا ہے، تم اسے پہچان ہی نہیں سکتے۔ کیا میں آدمی ہوں؟ خود مجھے بھی پتا نہیں۔'' وہ ہنستا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

نانی اور نواسی

آج جب میں کھانا کھا کے نلکے پر زور زور سے حلق صاف کرتے ہوئے منہ ہاتھ دھو رہا تھا، بڑھیا نے یاد دلایا کہ محلّے میں ایک شادی ہے، لہٰذا رات کا کھانا وہیں پر ملے گا۔ مجھے پتا نہیں کون مجھے شادی ہال میں لے گیا۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ بے شمار روشنیاں تھیں اور خوب صورت لڑکیاں اور ان کی مائیں جھلمل کپڑوں اور جگمگاتے زیوروں کی نمائش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہی آدھے سر کا گنجا آدمی میرے پاس آیا جس کا منہ انگریزی حرف او کی طرح گول گول کھلا رہتا ہے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے رنگین قمقموں اور پھولوں سے سجے ہوئے اسٹیج کی طرف لے کر گیا جس پر دولھا اور دُلھن بیٹھے تھے۔
''انھیں دعا دیجیے۔'' اس نے کہا، ''ماشاء اللہ'' میں نے کہا، ''بہت خوب صورت جوڑا ہے۔''
پھر دولھا سے ہاتھ ملایا اور دُلھن کے سر پر ہاتھ پھیرا، ''بڑی پیاری دُلھن ہے۔'' میں نے کہا، ''میں تو اسے جانتا ہوں شاید، کہیں یہ رقیہ تو نہیں؟''

''رقیہ۔'' دُلھن بولی، ''وہ تو میری نانی ہیں۔ میں تو ذکیہ ہوں۔''

آدھے گنجے سر والا آدمی بولا، ''ارے آپ اسے بھی نہیں پہچانتے یہ تو...''

اچانک کھانا کھلانے والی بڑھیا پھر کہیں سے ٹپک پڑی۔ بولی، ''چلو چلو کھانا لگ گیا ہے۔''

کالا قبرستان

مجھے پتا تھا کہ پہلے دس نمبر کی بس کالا قبرستان جاتی تھی۔ ہمارے بے شمار

رشتے دار، احباب، دوست اور ملنے جلنے والے وہیں مدفون تھے۔ میں نے آج اُدھر جانا چاہا تو کسی نے بتایا کہ دس نمبر کی بس تو عرصہ ہوا بند ہو چکی ہے۔

خیر میں نے پوچھا، ''کوئی نہ کوئی بس تو قبرستان کی طرف جاتی ہوگی۔''

وہ آدمی ہنس کے بولا، یار معاف کرنا، مردوں کو کسی بس سروس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسا کرو کوئی رکشہ وکشہ پکڑو۔ رکشے والے بہت تیز ہوتے ہیں، کسی بھی قبرستان پہنچ سکتے ہیں۔''

میں نے مشورہ قبول کرتے ہوئے ایک رکشے والے کو راضی کیا کہ وہ کالا قبرستان تلاش کرنے میں مدد دے۔ رکشے والا پہلے تو اس کے نام پر معترض ہوا، کالا قبرستان کیوں۔ ہاں پہلے ایک گورا قبرستان ہوا کرتا تھا اور اس میں بس گورے دفن کیے جاتے تھے۔

میں نے کہا، ''کالا قبرستان میں کالے دفن کیے جاتے ہوں گے۔''

بولا، ''اس شہر میں اس نام کا تو کوئی قبرستان ہی نہیں بلکہ شاید کوئی قبرستان نہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا، ''کیا اب لوگ مرتے نہیں؟''

''مرتے کیوں نہیں۔'' وہ ٹوپی جھاڑ کے بولا، ''لیکن ظاہر نہیں کرتے، بس زندہ بنے رہتے ہیں۔''

میں نے کہا، ''چلو چل کے ڈھونڈتے ہیں۔ کالا قبرستان کہاں تھا، کچھ کچھ مجھے یاد ہے۔ ذرا اُدھر چلو جدھر شہر ختم ہو جاتا ہے۔''

''اب شہر کہیں ختم نہیں ہوتا سر جی!'' رکشے والا بولا۔

اور واقعی شہر ختم ہی نہیں ہوا اور مکانوں اور کچے پکے گھروں کا سلسلہ دور تک پھیلتا گیا۔ پھر اچانک ایک سوکھی ندی بیچ میں آ گئی۔

میں نے کہا، ''بس اس کے کنارے کنارے ہی تو تھا کالا قبرستان۔''

رکشے والا بولا، ''اچھا تو آپ اس کی بات کر رہے ہیں۔ تو یہ کہیے نا کہ زندہ لوگوں کا قبرستان، کبھی یہاں مردے رہتے ہوں گے، اب تو کب سے ان کالی قبروں میں زندہ لوگ بستے ہیں۔ سر یہ اس شہر کی سب سے بڑی کچی بستی ہے۔''

کھوئے ہوئے لوگ

آج بڑھیا کے مہمان خانے میں کھانا کھاتے ہوئے میں نے اس سے کہا، ''اتنے دن ہوگئے، میں اپنا گھر تلاش کر رہا ہوں، نہ گھر ملتا ہے نہ گھر والے۔ تمھارا مہمان خانہ نہ ملتا تو کون مجھے روز کھانا گرم کر کے دیتا، کون میرے لیے بستر لگاتا۔ تم میرا اتنا خیال کرتی ہو، اللہ تمھیں خوش رکھے۔''

بڑھیا نے کہا، ''تمھیں دیکھ کے مجھے کسی ایسے شخص کی یاد آتی ہے جو برسوں پہلے یہاں سے گیا تھا اور واپس نہیں آیا۔''

میں نے کہا، ''مجھے اس کی کوئی تصویر دکھاؤ، ہوسکتا ہے میں نے اسے کہیں دیکھا ہو۔''

بڑھیا نے افسردگی سے کہا، ''لال رنگ کے اس بیگ میں جو سامنے والی کتابوں کی الماری کے نچلے خانے میں رکھا ہے ایک تصویر ہے اس کی، کبھی دکھاؤں گی۔''

میں نے کہا، ''میرا تجربہ ہے کہ جب لوگ کھوجاتے ہیں تو انھیں ڈھونڈنا بہت مشکل ہوتا ہے، میں اتنے دنوں سے شہر کے گلی کوچوں میں گھوم رہا ہوں۔ کسی نے مجھے نہیں پہچانا۔''

بڑھیا نے تعجب سے پوچھا، ''کیا واقعی کسی نے بھی نہیں؟''

''کسی نے نہیں۔'' میں نے جواب دیا، ''آج پہلی مرتبہ ایک گلی سے گزرتے ہوئے ایک کتا مجھے دیکھ کر بھونکنے کے بجائے ٹھہر گیا، مجھے فوراً اپنے اس چہیتے اور وفادار کتے کا خیال آیا جو میرے جانے کے بعد میری تلاش میں در بہ در بھٹکتا رہا تھا۔ پھر اس وقت میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا جب کتا میری جانب بڑھا۔ وہ میرے پاؤں میں لوٹنا چاہتا تھا۔ میں بھی چلتے چلتے رک گیا تاکہ اپنے اس دیرینہ دوست کا گرم جوشی سے استقبال کرسکوں۔ وہ اُدھر سے آگے بڑھا اور میں نے اِدھر سے قدم بڑھائے۔ مگر پھر اچانک اس نے تھوتھنی کو جھکایا اور تیزی سے میرے پاس سے گزر گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ میرے پیچھے فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی بڑی سی ہڈی کو چچوڑ رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ سب بدل گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس شہر میں زندوں اور مردوں کا حال ایک جیسا ہے۔ کوئی ایک دوسرے کی خبر نہیں رکھتا۔ ایک دوسرے سے واقف نہیں۔ ایک

دوسرے کو نہیں پہچانتا۔ سب قبرستان میں رہتے ہیں۔''

بڑھیا نے میری بات سن کے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بڑی دیر تک میری باتیں خاموشی سے سنتی رہی پھر جیسے فیصلہ دینے والے انداز میں بولی، ''سب کھوئے ہوئے لوگ ہیں۔''

میں نے کہا، ''مگر پہلے تو ایسا نہیں تھا جب میں گیا تھا اور یہ کل ہی کی تو بات ہے۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ سمندر آزاد تھا، پڑوس ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔ جانور وفادار تھے اور قبرستان بستی سے دور تھا مگر اب...''

بڑھیا پھر کچھ دیر خاموش رہی لیکن جب سکوت گہرا ہو گیا تو اس نے دوبارہ بات شروع کی جیسے اندھیرے میں ماچس کی تیلی جلائی جاتی ہے، تمھیں اپنا گھر ملا اور گھر والے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

اس نے کہا، ''میری دعا ہے کہ تمھارے گھر والے تمھیں مل جائیں۔ میں تمھارا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ جس کا کوئی کھو جاتا ہے اس پر کیا گزرتی ہے، میں جانتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

میں اس وقت کھانے کی میز پر بیٹھا تھا اور کمرے کے دوسرے کونے میں کتابوں کی الماری تھی جس کے آخری خانے میں لال رنگ کا ایک بیگ رکھا ہوا تھا۔

میں نے دل میں سوچا، بڑھیا بڑی دکھی ہے۔ یقیناً وہ اسے بہت عزیز تھا۔ وہ جو برسوں پہلے— اچانک میرے دل میں ایک انوکھی خواہش سمندر کی کسی چنچل لہر کی طرح تیزی سے ابھری، ذرا وہ تصویر دیکھی جائے۔ بڑھیا نے بتایا تھا کہ لال بیگ کے اندر...

میں نے بے چینی سے وہ بیگ اٹھایا اور کھولا۔ اندر چند کپڑے تھے اور کچھ مڑے تڑے کاغذات۔ میں نے پورا بیگ چھان مارا۔ اس میں تصویر نام کی کوئی چیز نہیں تھی، بس ایک چھوٹا سے آئینہ تھا۔

❁

ایک مصرع میرؔ کا

خوب صورت لڑکی ان کی نظر میں میرؔ کے کسی پُراثر مصرعے کی طرح تھی جس میں حسن بھی ہو اور حزن بھی مگر جب اس کی تلاش میں ناکامی ہوئی تو موصوف پورا دیوانِ میرؔ دوستوں کو بخش کے عازمِ سفر ہوئے— اور اب اتنے دنوں بعد اچانک—

لاس ویگاس کے ہوائی اڈّے سے جہاز نے ابھی اڑان ہی بھری تھی کہ بحرالکاہل کے پانیوں کا نیلا غبار آنکھوں میں بھر گیا اور بادلوں کی اوٹ سے سان فرانسسکو اپنے گولڈن گیٹ برج سمیت ابھر آیا۔ اتنے مختصر سفر میں جب آدمی کو ٹھیک سے پہلو بدلنے کی بھی مہلت نہیں ملتی، کسی ساتھی مسافر کا چہرہ کب یاد رہتا ہے مگر جناب وہ چہرہ تو بڑا جادو اثر نکلا۔ چہرہ کیا تھا، وقت کے اڑن کھٹولے کی سیر کا پروانہ تھا۔ میں پلک جھپکتے ہی کئی سمندر اور کئی براعظم پھلانگ کے دیوانِ میرؔ میں جا اترا— تو یہ تھے ہمارے شہزادہ جواں بخت جنھیں پرنس چارمنگ بھی کہا جاتا تھا۔ خوب صورت آدمی اور خوب صورت باتوں اور خوب صورت شعروں کے دل دادہ— کالج کی سب لڑکیاں ان کے آگے پیچھے گھومتی تھیں مگر ان کی جانب سے گرین سگنل ندارد— ایک مرتبہ موٹر سائیکل کے ایک حادثے میں زخمی ہوجانے پر موصوف اسپتال میں داخل تھے تو کالج کی سب سے مغرور لڑکی شاہدہ پھول لے کر ان کی عیادت کو جا پہنچی۔ پرنس چارمنگ نے پھول لے لیے اور مسکرا کے بولے،

''ہمشیرہ، آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی، فون کردیا ہوتا، پھولوں کا شکریہ— مگر مجھے ان سے چھینکیں آنے لگتی ہیں۔''

''کس قدر بدتمیزی کی بات ہے یہ۔'' میں نے انھیں غصے سے گھورا، ''تمھیں یوں کسی کا دل توڑتے شرم نہیں آتی۔''

''مگر یار ان لڑکیوں کو بھی تو دیکھو، کیسے کیسے عجیب دعوت نامے بھیجتی ہیں— دوستی، ضرورتِ رشتہ کا اشتہار بن جاتی ہے۔''

''خیر اس میں کیا برائی ہے۔'' میں نے احتجاج کیا، ''اگر کچھ دن ساتھ رہتے رہتے دو افراد ایک دوسرے کو دیکھ کے کچھ زیادہ ہی مسکرانے لگیں اور پھر اس نتیجے پر پہنچیں کہ وہ زندگی کے باقی ماندہ دن بھی اسی طرح ہنسی خوشی گزار سکتے ہیں تو یہ انتظام مجھے ایک طرح سے بڑا مناسب لگتا ہے۔ شاید اسی کو محبت، چاہت اور پسند کہتے ہیں اور اگر اس سلسلے میں کسی کو موردِ الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے تو وہ حضرت دل ہیں۔''

پرنس چارمنگ نے فرمایا، ''اگر ایک دوسرے کو غیر معینہ مدت کے لیے ہنسی خوشی برداشت کرنے کا نام محبت ہے، تب تو یہ خاصا بور خیال ہے۔''

اس کے بعد پرنس چارمنگ نے جن کا اصل نام سلیمان تھا، ڈاکٹری کی تعلیم کے آخری سال میں یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اعلیٰ تربیت امریکا میں حاصل کریں گے اور خود کو لوگوں کے دلوں کی تبدیلی کے لیے وقف کردیں گے تاکہ وہ کسو سے دل نہ لگاسکیں۔ میں نے پھر بھی انھیں یہ مشورہ دیا کہ جانے سے پہلے کسی ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑ ڈالو تاکہ دل سازی کا نیک کام شروع کرنے میں آسانی رہے مگر وہ تنک کے بولے، ''سنو میرے جاہل دوست! یہ اتنا آسان نہیں۔ آدم وحوا خالقِ ازل کے کہے ہوئے شعر کے دو مصرعے ہیں جو بچھڑ گئے ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے دوسرے مصرعے کی تلاش ہے لیکن جب تک کوئی ڈھنگ کا مصرع نہ ملے، شعر کیسے پورا ہو۔ بقول میرؔ، یہ بھی کارگہِ شیشہ گری والا معاملہ ہے، 'یعنی لے سانس بھی آہستہ—!''

پھر ڈاکٹر سلیمان نئی دنیا کو سدھار گئے اور ان کے بارے میں متضاد اور اکثر غلط

خبریں گردش کرتی رہیں۔ پرنس چارمنگ نے لوگوں کے دل کترتے کترتے ان کی جیبیں کترنیں شروع کردی ہیں کیوں کہ وہ بہت مہنگے سرجن بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان نے ایک اسپتال بنایا ہے جس میں بڈھے رنڈووں اور ریٹائرڈ عاشقوں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان نے ایک ایسی دوشیزہ سے شادی کرلی ہے جسے سال بھر پہلے حسینۂ عالم کا خطاب دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر سلیمان نے لاس ویگاس کے سب سے معروف جوا خانے کے پاس امراضِ قلب کا نیا اسپتال کھولا ہے جہاں ان لوگوں کا علاج کیا جاتا ہے جو زندگی کو بھی جوا سمجھتے ہیں۔

سفر کے دوران یوں اچانک مجھے ڈاکٹر سلیمان کی شکل نظر آئی تو سارے بھولے بسرے سوالات ذہن میں تازہ ہوگئے۔ ایئرپورٹ پر قدم دھرتے ہی میں نے موصوف کو سامان کے حصول کے لاؤنج میں جا گھیرا— میں نے دیکھا اس کی کنپٹیوں پر چاندی جھلملا رہی تھی مگر ہونٹوں پر وہی طلائی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ سے اس کی پہچان تھی۔ میں نے قریب جا کے زور سے ہاتھ ہلایا اور تقریباً چلّا کے شعر اچھالا:

پھرتے ہو میرؔ صاحب سب سے جدے جدے تم
شاید کہیں تمھارا دل ان دنوں لگا ہے

ڈاکٹر سلیمان نے پلٹ کے مجھے غور سے دیکھا اور پہچان کی ایک کرن اس کی آنکھوں میں چمکی، پھر وہ لہک کے بولا، ''اچھا، تو یہ تم ہو میرے رقیب جانی، اس دیارِ سامری میں۔ تعجب ہے یہ آرام طلب سایۂ دیوار سے کب برآمد ہوا؟'' پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا، دیکھا، میں کچھ نہیں بھولا اب تک۔ آدمی نہ شعر! گرچہ کتنے سمندر اور کتنے زمانے ہم دونوں کے درمیان سے گزر گئے ہیں مگر پرانے مصرعے، شعر اور گیت اب تک میرے اندر یوں گونجتے ہیں جیسے پریشر کوکر میں بھاپ کی سیٹیاں! میں نے قہقہہ لگایا— ''چلو اس سے پتا چلا کہ دیارِ غیر میں کچھ تو ہے تمھارے پاس، جس سے گئی رُتوں کی یاد باقی ہے۔ ورنہ بستی کے گلی کوچوں میں تو یہ افواہ اُڑ گئی تھی کہ اب کہیں جنگلوں میں ملتے نہیں، حضرتِ خضر مر گئے شاید۔ برسوں سے اپنے نشتر کی نوک سے دلوں کے بھید کھول رہے ہو، کہیں محبت کا

وہ دفینہ بھی ہاتھ لگا جس میں صرف تمھارے نام کا یاقوت پوشیدہ ہے؟''

سلیمان ہنسا، ''لمبی کہانی ہے پیارے۔ اس وقت تم سے ملنے کی خوشی میرے لیے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ بتاؤ کہاں ٹھہرے ہو، کب تک رہو گے، میرے پاس کیوں نہیں آجاتے۔ آؤ جی بھر کے شعر سنائیں اور بچھڑے لوگوں کو یاد کریں۔''

میں نے جواب دیا، ''میں ویگاس اپنی بیٹی کے پاس آیا تھا، اب سان فرانسسکو میں اپنے بیٹے کے پاس ڈیرہ جماؤں گا اور پھر گھر کی راہ لوں گا۔ تمھیں تو پتا ہے کہ میرا مصرعۂ ثانی بڑی مشکل بحر میں ہے۔

سلیمان نے ایک بار پھر گلے لگایا۔ پھر جیب سے اپنا کارڈ نکال کے دیا، ''اس پر سارے فون نمبرز درج ہیں۔''

میں نے پوچھا، ''سنا ہے تمھارا اسپتال ویگاس میں بھی ہے، کسی جوا خانے کے برابر میں۔ لگتا ہے تم اس وقت وہیں سے آرہے ہو— جوئے میں دل بہت ٹوٹتے ہیں یقیناً تمھارا کاروبار اچھا چلتا ہوگا؟''

سلیمان زور سے ہنسا، ''یہاں تو ہر طرف ہی جوئے کا دور دورہ ہے، کیریئر، شادی، مستقبل— کسی کا بھروسا نہیں۔ دل ٹوٹتے رہتے ہیں لہٰذا ہم جیسوں کی مانگ ہے۔ مگر سنو، ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔ بھولنا مت—'' پھر اسے کچھ یاد آیا، کہنے لگا، ''سنو اگلے ہفتے مجھے یہاں ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کرنی ہے، تم ہوٹل میں میرے پاس رہنا، یہیں سے میں تمھیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ میں قریب ہی رہتا ہوں۔'' اس نے جھٹ پٹ میرا فون نمبر اور پتا لیا اور اپنے قافلے کے ساتھ چل دیا۔

ابھی ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک دن گھر کے دروازے پر ایک لمبی سی گاڑی کھڑی تھی۔ میں باہر نکلا۔ باوردی ڈرائیور نے اتر کے ادب سے سلام کیا اور بولا، ''سر ڈاکٹر صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔ کانفرنس ختم ہو چکی ہے اور اب وہ ہوٹل میں آپ کے منتظر ہیں۔''

میں نے اپنے بیٹے اور بہو کو بتایا، ''جگری دوست کی طرف سے بلاوا آیا ہے،

لہٰذا اب واپسی تک میری مہمان داری اس کے ذمے!'' میں نے اپنا سفری بیگ اٹھایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سلیمان بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ ''آج رات ہم سوئیں گے نہیں، صرف باتیں کریں گے، شعر سنائیں گے اور —!''

پھر ایسا ہی ہوا، ہم دونوں جاگتے رہے اور ایک دوسرے کو اچھے، برے، نئے، پرانے شعر سناتے رہے۔ کبھی سلیمان ایک مصرع داغتا اور میں دوسرا، کبھی میں کوئی شعر سناتا اور وہ اسی نسل کا دوسرا شعر سنا کے مجھے لاجواب کر دیتا۔ اچھے شعروں اور اچھے مصرعوں کا انتخاب ہمارا پرانا شوق تھا۔ سلیمان کے لیے اس کے 'مصرعۂ ثانی' کی تلاش کے دوران میں کبھی کسی کافر ادا کو کالج کی کوریڈور میں اٹھلا اٹھلا کے چلتے دیکھ کر سلیمان کو متوجہ کرتا — ''دیکھو دیکھو میرؔ کا مصرع!''

''یہ مصرع میرؔ کا نہیں اقبالؔ کا ہے میرے بھائی —'' وہ بگڑ کے جواب دیتا، ''دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں —'' پھر میں کسی سادہ سی گھریلو اور خاموش لڑکی کی طرف اشارہ کرتا، ''اور یہ؟'' وہ ایک نظر اُدھر ڈالتا اور ناک سکوڑ کے اپنا فیصلہ سناتا — ''یہ تو پورے کا پورا اسماعیل میرٹھی کا مصرع ہے، 'بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ۔'''

میں یکایک بستر پر اٹھ کے بیٹھ گیا اور سلیمان کو مخاطب کر کے بولا، ''تمھیں یاد ہے وہ لڑکی جس کے بارے میں تم کہتے تھے، لڑکی ہے کہ نثری نظم — آنکھیں ہم قافیہ نہیں، باتیں اکھڑی کھڑی، خیال الجھے الجھے، بال روکھے سوکھے، جیسے وجودی فلسفہ!''

سلیمان نے پائپ کا ایک کش لیا اور بولا، ''کیوں نہیں — میں ان بہن جی کو تو بھول ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے خاکسار کو ایک رقعہ تحریر کیا تھا جس کا آغاز کرتے ہوئے لکھا تھا، مجھے آپ کو یہ خط لکھتے ہوئے بڑی شرم آرہی ہے۔ میں نے انھیں ادب سے جواب دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ آئندہ میرے لیے کبھی کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے آپ کو شرم آئے۔''

میں نے کہا، ''خیر وہ تو گئے دنوں کی باتیں ہیں، اب کچھ نئی تازہ سناؤ — بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات — پھر کوئی ملا ایسا چہرہ، ایسا شخص، ایسا فرد جو تمھیں اچھا لگا

ہو، خوب صورت اور گلاب صفت — یعنی نازکی اس کے لب کی کیا کہیے!''

سلیمان نے غٹاغٹ کولڈ ڈرنک کا ایک کین چڑھایا اور بولا، ''مجھے تجربے نے سکھایا ہے کہ یہ دنیا، یہ سرائے فانی، روحوں کا عارضی مسافر خانہ — آوازوں کا گنبد ہے — اس میں لوگ آوازوں کی طرح بستے ہیں اور صدا لگا کے اپنی راہ لیتے ہیں، گویا مرد و زن، شعر اور مصرعے، سب آوازیں ہیں جو اس دنیا کو آباد رکھتی ہیں اور جب کوئی نئی آواز سنائی دیتی ہے تو جیسے کوئی نئی دنیا دریافت ہوتی ہے، رابرٹ فراسٹ نے کہا ہے کہ شاعری خود نئی دنیا کی دریافت ہے۔''

میں نے کہا، ''مرحبا! نئی دنیا کے انکشافات نے تمھیں میرؔ سے رابرٹ فراسٹ تک پہنچایا مگر میرے عزیز! تمھیں وہ مصرع بھی کہیں ہاتھ لگا جو تمھاری زندگی کے شعر کو مکمل کرنے کے لیے ضروری تھا؟'' ''کیوں نہیں — '' سلیمان نے جواب دیا، ''بہت سے مصرعے، بہت سی آوازیں، بہت سے لمس، سائے اور چہرے — اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں — اور دل تو ایک براعظم ہے وسیع و عریض مگر پھر بھی بعض چہرے اس میں سما نہیں پاتے اور بعض کسی دور افتادہ ستارے کی طرح ٹمٹماتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں اور پھر پورا چاند بن جاتے ہیں — میں نے تو آوازوں کا پیچھا کرتے یہی دیکھا۔ چہرے بہت تھے اور آوازیں بے شمار — لیکن پھر ایک دن لگا کہ دل کی کھیتی ہری ہونے لگی ہے اور اس میں تخمِ خواہش گل کھلانے لگا ہے۔''

میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں سوال کیا، ''ارے تو کیا یہ وہی خاتون تو نہیں جنھیں کبھی حسینۂ عالم کا تاج پہنایا گیا تھا؟''

''حسینۂ عالم — '' وہ چونکا، ''ہوسکتا ہے، وہی ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ جب انھیں حسینۂ عالم کا خطاب ملا ہوگا تب وہ اتنی حسین نہیں ہوں گی مگر اب وہ کسی بھی حسینۂ عالم سے زیادہ — ''

''یقیناً ہوں گی — '' میں نے کہا، ''ایک عالمی شہرت یافتہ دل کے سرجن سے شادی نے ضرور ان کے حسن میں اضافہ کیا ہوگا اور مرتبے میں بھی — مگر مجھے تو اس بات کی خوشی

ہے کہ تمھیں آخر کار اپنا 'مصرعۂ ثانی' تو میسر آیا— تمھاری ان سے کہاں ملاقات ہوئی؟''

سلیمان نے ایک لمحے کچھ سوچا، پھر دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا، ''میں نے پہلی بار انھیں بچوں کے ایک اسکول میں پیانو بجاتے دیکھا۔ وہ موسیقی کی ٹیچر تھیں۔ ان کی خوب صورت انگلیاں پیانو پر سریلے گیت اور سہانے خواب لکھتی تھیں۔ وہ سب گیت اور وہ سارے خواب سب بچوں کو اپنے لگتے تھے۔ بچے انھیں دیکھ نہیں سکتے تھے کیوں کہ وہ سب کے سب نابینا تھے مگر جب وہ کوئی دھن چھیڑتیں تو سب کی آنکھوں میں روشنی سی بھر جاتی۔ ان کی انگلیوں سے پھوٹتی کرنوں سے جگمگاتی دنیا مجھے بھی بہت خوب صورت لگی۔ مجھے تعجب ہوا اس سے پہلے مجھے یہ دنیا کبھی نظر نہیں آئی تھی تو میں بھی نابینا تھا— مجھے اس وقت پتا چلا!'' سلیمان نے ایک لمحے کو رک کے پائپ کا کش لیا۔

''اچھا تو—'' میں نے بے تاب ہو کے سوال کیا، ''اس خوب صورت دنیا کی خالق سے تمھاری شادی کیسے ہوئی؟'' سلیمان نے جواب دیا، ''میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا، ''کیا اچھا ہو، اگر میں ہمیشہ کے لیے تمھاری دنیا میں آسکوں۔''

''پھر—؟'' میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''پری نے یہ سن کے تبسم کیا—'' سلیمان نے پھر پائپ منہ سے لگا لیا۔

میں نے متاثر ہو کے کہا، ''میں ان سے ملنا چاہتا ہوں جلد سے جلد— تم دونوں تو مردہ دلوں میں نئی زندگی پھونکنے کا کام کر رہے ہو۔ اگر تم ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتے ہو تو وہ ٹوٹے ہوئے دلوں میں جینے کی امنگ پیدا کرتی ہیں— اپنے گیتوں سے۔''

سلیمان نے کہا کہ صبح کے ناشتے کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے جائے گا، اپنی خوب صورت دنیا دکھانے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے کہا، ''امراضِ قلب کے ماہرین دل میں بسی بیماریاں ڈھونڈتے ہیں، جینے کی آرزو اور مستقبل کے خواب نہیں— وہ خوب صورت دنیا نہیں جو اس کے اندر ہے۔ دل کی دنیا عجیب ہے، اس کے چار خانوں میں سب کچھ سما جاتا ہے— سب اچھائیاں— دنیا کے سارے رنگ، آدمی کی سب تمنائیں اور سب خواہشات— کتنا ضروری ہے دل— مگر حیرت ہے کہ دل کا جراح بھی جو اسے

کاٹ چھانٹ کے دھڑکنے کے قابل بناتا ہے، دل کا مسیحا نہیں ہوتا— میں خود ایک سرجن ہوں اور الف لیلہ کے دھوکے باز چراغ فروش کی طرح آواز لگاتا پھرتا ہوں کہ پرانا دل پھینک کے نیا دل لگوا لو مگر مجھے پتا ہے کہ میں دل کو زندہ نہیں کر سکتا، دل کو زندہ کرنے والے تو اور لوگ ہوتے ہیں۔''

اور اب میں سلیمان کے ساتھ اس ہستی سے ملنے جا رہا تھا جس کے نام سے اس کا دل دھڑکتا تھا۔ میں سلیمان کے نجی ہیلی کوپٹر میں آدھے گھنٹے کی پرواز کے بعد اس کے محل نما گھر کے سبزہ زار پہ جا اترا۔ وسیع و عریض باغ کے بیچ میں سفید برجیوں اور مخروطی میناروں سے سجی ہوئی ایک عالی شان عمارت ہماری منتظر تھی۔ ہم لوگ سرخ بجری کی روش پر چل کے سفید دروازے سے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ جگمگاتے فانوسوں، قیمتی قالینوں اور خوب صورت پینٹنگز سے مزین ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ کے سلیمان نے ایک باوردی ملازم کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ مالکہ کو مہمان کے آنے کی اطلاع کرے۔ ''مالکہ یا ملکہ؟'' میں نے شوخی سے پوچھا۔

سلیمان مسکرایا، ''گھر کی مالکہ اور دل کی ملکہ!''

چند لمحوں بعد ملازم واپس آیا، ''وہ تشریف لا رہی ہیں جناب!''

پھر سفید دروازے کھلے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا۔ ایک وہیل چیئر آہستہ سے اندر داخل ہوئی جس پر ایک آبنوسی خاتون کسی دل کش تصویر کی طرح سجی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں گنگناتی ہوئی لگیں اور ہونٹوں پر ایسی خوب صورت مگر اداس مسکراہٹ دمک رہی تھی جس پر مونا لزا کو بھی رشک آئے۔

سلیمان نے تیزی سے آگے بڑھ کے وہیل چیئر کو تھاما اور خاتون کی طرف جھک کے پیار سے کہا— ''لو، آج میں اپنے عزیز ترین دوست کو تم سے ملانے لایا ہوں۔ یہ بھی شعروں کا دیوانہ ہے!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بیوقوفوں کی طرح بولا، ''مرد اور عورت مجھے بھی شعر کے دو مصرعے لگتے ہیں!''

خوابوں کے گھر

''تو آج کل تم کیا لکھ رہے ہو؟'' کافی کا ایک گھونٹ بھر کے میں نے اکبر سے پوچھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے نظر اٹھا کے دیکھا اور پھر افسردگی سے بولا، ''کیا لکھوں یار، میری کہانی کے تو مرکزی کردار ہی کھو گئے ہیں!''

''کیا؟'' میں حیران ہوا، ''کہاں کھو گئے ہیں؟''

''لمبی کہانی ہے۔'' وہ بولا، ''وہ روز گھر سے نکل کے اپنے اپنے کام پر جاتے تھے مگر ایک دن جو گئے تو واپس ہی نہیں آئے۔ بس انھیں ڈھونڈتا رہتا ہوں آج کل۔''

اکبر میرا دوست تھا اور ایک مقبول ہفت روزہ رسالے کا معروف ادیب جس کے ناول اس رسالے میں قسط وار شائع ہوتے تھے مگر اب ادھر کافی دنوں سے اس کی کوئی چیز سامنے نہیں آئی تھی، لہٰذا آج جب اتفاقاً کافی ہاؤس میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے سب سے پہلے اس سے یہی سوال کیا مگر اس کا جواب ایسا تھا کہ میں چکرا کے رہ گیا۔

میں نے پوچھا، ''تمھارے دونوں کرداروں کے نام کیا ہیں؟ کچھ ان کا حدود اربعہ بتاؤ، ہوسکتا ہے میں ان کی تلاش میں تمھاری کچھ مدد کرسکوں، کوتوال شہر سے پرانی یاری ہے اپنی۔ وہ ضرور کوئی ترکیب نکالے گا۔ ان تک پہنچنے کی۔ کیا پتا وہ اٹھا لیے گئے ہوں۔ کہیں اغوا برائے تاوان کا معاملہ نہ ہو۔ بعض خفیہ ایجنسیاں بھی بڑی سرگرم ہیں آج کل جو

ملک دشمن عناصر کی تلاش میں رہتی ہیں مگر بار بار بس عام شہری ان کے ہتھے چڑھتے ہیں۔''

اکبر نے جیب سے رومال نکالا اور منہ پر رکھ کے اتنے زور سے چھینک ماری کہ میز پر رکھی کافی کی پیالیوں میں بھونچال سا آ گیا۔ پھر وہ رومال تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے بولا، ''مجھے نہیں لگتا پولیس ان کی تلاش میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ انھیں کسی نے اغوا نہیں کیا، وہ دونوں خود ہی کسی مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔ ساحر اور سمن، میاں بیوی ہیں دونوں۔ اگر چہ میں نے انھیں تخلیق کیا ہے مگر میں خود ان کی روز روز کی مہم جوئی سے تنگ آ گیا ہوں۔ دونوں ہر روز کسی نئی دنیا کو دریافت کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں، ایسی بے چین روحیں شاید ہی کسی نے دیکھی ہوں۔''

میں نے پوچھا، ''تمھاری تو ان سے خوب بات چیت ہوتی ہوگی۔ تمھیں کوئی تو اندازہ ہوگا کہ ان کے دل میں کیا ہے، کبھی تو وہ تمھیں اپنے راز میں شریک کرتے ہوں گے!''

اکبر کی پیشانی پر سوچ کی لکیر ابھری۔ وہ چند لمحے چپ رہا، پھر کہنے لگا، ''یہ جو عورت سمن ہے ناں— بہت خواب دیکھتی ہے، ہر روز نیا خواب، نئی دنیا کا خواب— کہتی تھی، اسے اپنا گھر پسند نہیں، بہت ساری سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں، چھت سے پلستر جھڑتا رہتا ہے، باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اب وہ کسی اچھی جگہ اپنا گھر بنائے گی، جہاں بہت سے درخت ہوں اور درختوں میں کوئلیں اور فاختائیں—''

''اور ساحر؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں ساحر—'' اکبر نے پھر خلا میں نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ بھی عجب سرپھرا مرد ہے۔ کہتا ہے اس سے ٹوٹی پھوٹی، کھانستی کھنکارتی بسوں میں چڑھا نہیں جاتا، وہ اپنی نوکری بھی بدلنا چاہتا ہے، کہتا ہے اسے اپنے باس کے سر پر ہمیشہ دو سینگیں نظر آتی ہیں اور دفتر کے ساتھیوں سے بات نہیں کی جاتی کیوں کہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی برائی کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص نے اپنے منہ میں بچھو پال رکھا ہے!'' اچانک اکبر خاموش ہوگیا، پھر اپنی گھڑی دیکھ کے بولا، ''اچھا اب میں چلتا ہوں، شام کے سات بجنے

والے ہیں۔ سمن کی عادت تھی کہ وہ ہر روز سات بجے تک گھر لوٹ آتی تھی، ہوسکتا ہے، آج...!'' وہ اٹھا اور ہاتھ ملا کے کافی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔

دوسرے روز میں ناشتے کی میز پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ''تلاشِ گم شدہ'' کے ایک اشتہار پر نظر پڑی، لکھا تھا، ''سمن اور ساحر کے نام—! دیکھوتم لوگ جہاں بھی ہو، واپس آجاؤ، میری کہانی نامکمل پڑی ہے۔ میں چاہتا ہوں، آگے جو کچھ بھی لکھوں تم سے پوچھ کے لکھوں، لوٹ آؤ تاکہ تم سے بہت کچھ کہا جائے، بہت کچھ سنا جائے—! تمھارا کہانی کار۔''

میں نے اکبر کو فون کیا مگر اس نے فون نہیں اٹھایا اور دیر تک ایک نسوانی آواز اکبر کے شائع ہونے والے ناولوں اور اس کی کہانیوں کے عنوانات دُہراتی رہی اور یہ کہتی رہی کہ اگر زندگی کو جاننا ہو تو یہ کہانیاں پڑھیے جو جھوٹی ہونے کے باوجود سچی ہیں۔ جب دیر تک انتظار کرنے کے باوجود اکبر سے بات نہ ہوسکی تو میں نے فون بند کردیا اور کچھ پرانے رسالے نکال کے ان میں اکبر کے ایک پرانے ناول کی قسطیں پڑھنے لگا۔ مجھے یہ جان کے حیرانی ہوئی کہ اس کے پرانے ناول کے کرداروں کے نام بھی سمن اور ساحر تھے۔

تقریباً ایک مہینے تک اکبر سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ایک روز وہ اچانک مجھے شہر کی مرکزی شاہراہ پر ایک بس اسٹاپ کے قریب کھڑا نظر آیا۔ وہ ایک عمارت کی بالائی منزل پر لگے ہوئے بڑے سے نیون سائن کو غور سے دیکھ رہا تھا جس پر رنگین متحرک روشنیوں سے دل کش منظر ترتیب پا رہے تھے— خوب صورت چہرے اور عالی شان عمارتیں۔

میں نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا— ''یار اکبر! تم کہاں رہے اتنے دنوں؟'' میں نے کہا، ''میں اسی طرح تمھاری تلاش میں تھا جیسے تم اپنے کرداروں کی تلاش میں ہو۔'' خدا کا شکر ہے تم مل گئے، تمھارے کردار ملے یا نہیں؟''

اکبر ایسے چونکا جیسے سوتے سے جاگا ہو، پھر وہ مجھے دیکھ کے مسکرایا اور بولا، ''آؤ کہیں بیٹھتے ہیں۔'' ہم دونوں سامنے ہی واقع ایک ایرانی چائے خانے میں چلے گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، اسی دوران ایک بیرا میز صاف کرکے چائے کا آرڈر لے کر چلا گیا۔

''تم کہاں غائب ہو یار ان دنوں— فون بھی نہیں سنتے؟'' میں نے شکایتاً کہا،

''ہاں، اس نے پیشانی سے بالوں کو ہٹایا۔'' کچھ زیادہ ہی مصروفیت رہی پچھلے دنوں۔'' اسی وقت بیرے نے ہمارے سامنے چائے کے کپ اور دوسرے برتن میز پر سجا دیے۔ اکبر نے کیتلی میں چمچا گھمایا، پھر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ اس کے بعد ایک کپ میری طرف سرکا کے بولا، ''تم میرے کرداروں کے لیے کیوں پریشان ہو؟''

''پریشان کیوں نہ ہوں بھئی؟'' میں نے ہنس کے جواب دیا، ''تمھارا ناول جو پڑھنے کو نہیں مل رہا ہے ان دنوں۔'' میں نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا لی۔

اکبر اپنی پیالی میں چمچے سے شکر گھولتا رہا۔

''تو...؟'' میں نے سوال کیا، ''دمن کو نیا گھر ملا اور ساحر کو نئی ملازمت، نئے ساتھی اور نئے افسر—''

''ایک دن کی بات ہے۔'' اکبر نے کہنا شروع کیا، ''دمن واپس آگئی، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ بولی، آج میں نے اپنے خوابوں کا گھر ڈھونڈ لیا ہے۔''

''خوابوں کا گھر؟''

''ہاں بہت خوب صورت گھر ہے۔ اس کے دروازے شیشے کے ہیں اور کھڑکیوں میں پرندوں کی سریلی آوازوں کا اجالا رہتا ہے، ہم جلد ہی وہاں چلے جائیں گے۔''

''اور ساحر کے خوابوں کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

اکبر نے کہا، ''اس نے بتایا کہ اسے ٹوٹی پھوٹی بسوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی ہے— اور اسے اپنی ڈریم کار ملنے والی ہے— سرخ رنگ کی لمبی سی کار جس کے اگلے حصے پر ایک بڑی سی تتلی اپنے پر پھیلائے بیٹھی ہے— اور وہ اب خود ہی اپنا باس ہے۔ پھر ان دونوں نے اطلاع دی کہ وہ اپنے نئے گھر میں منتقل ہونے والے ہیں۔''

میں نے پوچھا، ''ان دونوں کے کوئی اولاد نہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' اکبر نے جواب دیا، ''ایک گول مٹول سا بیٹا ہے ان کا۔ نیلے کنچے جیسی آنکھیں ہیں اس کی۔ وہ کہتے ہیں انھیں اپنے بیٹے کے لیے بہت ساری اچھی

اچھی چیزیں جمع کرنی ہیں — کھلونے، خوب صورت بستر اور ولایتی دودھ کے ڈوبے۔''

''اچھا!''

''ہاں۔'' اور سمن نے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے شان دار مستقبل کے خواب دیکھ رہی ہے، وہ بڑا ہوگا، اسکول جائے گا، اس کے لیے خوب صورت یونی فارم خریدنا ہوگا اور کتابیں اور اچھا سا بستہ! ''سمن کے تو خواب ہی ختم نہیں ہوتے۔''

میں نے کہا، ''یار بڑے عجیب کردار تخلیق کیے ہیں تم نے بھی — ویسے تم نے کبھی یہ کوشش بھی کی کہ ان کے ساتھ جا کے خود اپنی آنکھوں سے ان کے خوابوں کا گھر اور وہ ڈریم کار دیکھتے؟''

اکبر نے جواب دیا، ''کیوں نہیں، میں گیا تھا وہاں — میں نے وہ سب چیزیں وہاں دیکھیں۔''

''ارے —'' میں نے حیرت سے کہا، ''پھر تو بڑے مزے میں رہتے ہوں گے وہ دونوں — ایک دوسرے کے پیار میں مگن — اپنے اپنے کام پر بھی جاتے ہوں گے۔''

اکبر نے کہا، ''ہاں ہاں، ساحر ایک مشہور بینک کا افسرِ اعلیٰ ہے اور سمن ایک بیوٹی پارلر کی مالک — کہہ رہی تھی جو عورت اس کے پارلر سے بن سنور کے نکلتی ہے، اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔''

''اچھا تو اب تم اپنے نئے ناول کی قسطیں کب شروع کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ناول تو چھپنا بھی شروع ہو چکا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں۔'' اکبر بولا، ''اس میں نیلے سمندر کے سفید ساحل پر واقع ایک خوب صورت بستی کا بیان ہے — سرخ کھپریل والے گھروں کی قطاریں، پام اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ، چمچاتی گاڑیاں، عمدہ سلے ہوئے سوٹوں میں ملبوس مرد جن کے چہروں پر نفاست سے کیے ہوئے شیو کے سبز حاشیے جگمگاتے ہیں۔ بام پر آئی ہوئی خوب صورت دوشیزائیں، موبائل پر بات کرتے ہوئے شگفتہ چہرے، جھولا جھولتے ہوئے گول مٹول بچے — تم نے پڑھا نہیں میرا ناول؟''

اور میں نے اگلے ہفتے رسالے میں اکبر کا ناول پڑھنا شروع کیا۔ اس باب میں

ثمن نے بتایا تھا کہ نئی بستی میں آنے سے پہلے وہ کیسی مصیبت زدہ تھی، اسے کیسے بوسیدہ اور خراب کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ روزانہ طویل فاصلے پیدل چل کے طے کرنا پڑتے تھے جس کی وجہ سے اس کے سینڈلوں کی ایڑیاں بار بار گھس جاتی تھیں، نوکری تکلیف دہ تھی اور گھر میں تیل کے چولھے پر کھانا پکاتے ہوئے کتنی ہی بار اس کی ساری کے پلو میں آگ لگ گئی تھی۔

اسی طرح ساحر نے انکشاف کیا تھا کہ اپنے دفتر جانے کے لیے اسے جو پتلون عرصے تک پہننی پڑتی تھی، اس کی جیبیں پھٹی ہوئی تھیں لیکن چونکہ اس کے پاس جیب میں رکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا، کام چل جاتا تھا۔ اس کا باس بہت نک چڑھا تھا اور بات بات پر تنخواہ کاٹ لینے کی دھمکی دیتا تھا، اگرچہ وہ تنخواہ کاٹتا نہیں تھا مگر اس کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ مہینے کے آخر میں جب اسے پیسے ملتے تو اسے یہی لگتا کہ آدھی تنخواہ صاحب کے غصّے کی نذر ہوگئی ہے۔ گرمیوں میں کمرے کے اندر پنکھا نہ ہونے کی وجہ سے سخت گھٹن ہوتی۔ لہٰذا ان دونوں کو اپنے کپڑے وبال ہی لگتے۔ اور سردیوں میں ٹھنڈ اتنی زیادہ ہوتی اور لحاف اتنا پتلا کہ خود کو گرم رکھنا مشکل ہوتا، اس لیے وہ ایک دوسرے سے لپٹ کے سوتے۔

ناول کی ایک قسط اسی طرح ختم ہوئی۔ اگلی قسط میں اکبر نے ثمن کے پرانے گھر کا احوال لکھا تھا جس میں صرف ایک کمرہ تھا اور اس کی چھت میں اتنے سوراخ تھے کہ ان سے اتنی وافر روشنی اندر آتی تھی کہ کمرے میں کسی کھڑکی یا روشن دان کی انھیں کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ بارش کے موسم میں ان کے گھر کے سارے لوٹے اور کٹورے چھت سے ٹپکتے پانی کو ذخیرہ کرنے میں کام آتے۔ اپنے خوابوں کے گھر میں منتقل ہونے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ انھیں پرانے گھر کی مصیبتیں یاد نہ رہی تھیں۔

پھر کئی باب اور چھپے ثمن اور ساحر کے شب و روز کے بارے میں جو خوشیوں کے اجالوں سے منور تھے۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ آخری باب میں ثمن اور ساحر کے بیٹے کی پہلی سال گرہ کی تقریب کا حال بیان ہوگا لیکن اس کے بعد اچانک یہ سلسلہ رُک گیا اور رسالے کے مدیر کی جانب سے قارئین کے لیے یہ اعلان کیا گیا کہ ناول کا آخری باب

مصنف کے اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے شائع ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔ مصنف کو دل کا دورہ پڑا تھا۔

میں نے رسالے کے دفتر کو فون کر کے پتا کیا کہ اکبر کس اسپتال میں زیر علاج ہے۔ پھر میں ایک شام اس کی عیادت کو جا پہنچا۔ ''مجھے نہیں پتا تھا کہ تم ان دنوں اپنے دل کی ناز برداری میں مصروف ہو جس کی وجہ سے ناول کے آخری باب کی اشاعت کھٹائی میں پڑ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ مسکرایا— ''آخری باب میں نے لکھ لیا ہے۔ بس یہاں سے نکلتے ہی نظرِ ثانی کے بعد چھپائی کے لیے دے دوں گا۔''

میں نے کہا، ''تمھارے پڑھنے والے ثمن اور ساحر کے بیٹے کی پہلی سال گرہ کے جشن کا احوال جاننے کے لیے بے چینی سے تمھاری تحریر کے منتظر ہیں!''

اچانک اکبر کا منہ لٹک گیا— ''سال گرہ تو نہیں ہو سکی!'' وہ بولا۔

''کیا؟'' مجھے دھچکا سا لگا، ''تمھیں پتا نہیں ثمن اور ساحر کے کتنے فین بن چکے ہیں۔ وہ ان کے بیٹے کی سال گرہ کی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال ضرور سننا چاہیں گے۔''

''مگر ایسا ہو نہیں پایا—'' اکبر نے تاسف سے کہا، ''میں گیا تھا دونوں کی طرف، مگر جانتے ہو کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا، ''وہ ملے نہیں کیا؟''

''ملے، مگر گھپ اندھیرے میں سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے— وہ بس اوپر کی طرف تک رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے کالا آسمان جھانک رہا تھا۔''

''وہ کیوں؟'' میں حیران تھا۔

''بھئی بجلی جو نہیں تھی—'' اس نے کہا، ''سب قمقمے اور نیون سائن بجھا دیے گئے تھے۔ بلدیہ نے تمام برقی اشتہاروں کو ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے!''

''تو—؟'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

اکبر نے برابر کی میز پر سے ایک اخبار اٹھایا اور ایک خبر کی طرف اشارہ کیا جس

کے گرد سرخ دائرہ کھنچا ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ بجلی کی کمی پر قابو پانے کے لیے برقی اشتہارات پر پابندی ضروری ہوگئی تھی۔

میں نے پوچھا، ''مگر اس سے ثمن اور ساحر کا کیا تعلق ہے؟''

اکبر نے آنکھیں بند کرلیں اور کہنے لگا، ''وہ دونوں وہیں تو رہتے تھے، اپنے گول مٹول بچے سمیت — بجلی بجھنے سے ان کے خوابوں کے گھر بھی تاریک ہوگئے ہیں۔ میں اب انھیں اندھیرے فٹ پاتھ پر بیٹھے دیکھ آیا ہوں۔ اس کے بعد وہ کہاں جائیں گے، کچھ پتا نہیں — میرا ناول یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔''

گھروندے

اسے سب سے زیادہ اپنے گھر کی فکر تھی کہ وہاں کیسے پہنچے گا۔ مگر ایئرپورٹ پر باہر آتے ہی ایسا ٹیکسی والا مل گیا جو نہ صرف اس علاقے سے واقف تھا بلکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہاں کم سے کم وقت میں پہنچنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ ''آپ فکر نہ کریں— '' وہ اس کا سوٹ کیس پیلی ٹیکسی کے عقبی خانے میں پھینکتا ہوا بولا، ''میں بھی وہیں قریب میں رہتا ہوں۔ مجھے آپ کا گھر ڈھونڈنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

اس نے کہا، ''مگر تمھیں گھر ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوگی میرے بھائی، سنتے ہیں اس گلی میں مڑتے ہی اوپر والی منزل کے چمکیلے شیشے والی نیلی بالکونی دور سے نظر آجاتی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ٹیکسی والے نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا، ''آپ نے اپنا گھر خود نہیں دیکھا ہے کیا؟''

''نیا گھر ہے بھائی— نیا نیا بنا ہے— اس کی خاطر تو اتنا دور... تمھیں کیا پتا کس مشکل سے بنا ہے یہ گھر!''

ٹیکسی ڈرائیور ہنسا، ''مبارک ہو، جس شخص کا اپنا گھر ہوتا ہے اس سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا؟''

اس نے کہا، ''بھئی آخر اتنے دن سے دور ہوں، بہت سختیاں برداشت کی ہیں— بچوں کی خاطر— گھر والوں کی خاطر— اب گھر بن گیا ہے تو سمجھو برسوں کی تمنا پوری ہوئی۔''

ٹیکسی والے نے پوچھا، ''آپ باہر کام کرتے ہیں؟''

''ہاں بھئی!'' اس نے جواب دیا۔

''خوش نصیب ہیں آپ۔'' وہ بولا۔

اس نے کہا، ''خوش نصیبی کا ہے کی۔ یہ تو آب و دانے کی بات ہے۔ بہر حال اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ گھر بن گیا۔ دوسرے دو بچوں کے لیے باہر ہی پڑھائی لکھائی کا سامان ہوگیا۔''

ٹیکسی ڈرائیور پھر بولا، ''خوش نصیب ہیں آپ۔''

اس نے کہا، ''ایک بچے نے تو تعلیم پوری کر کے وہیں پر ملازمت بھی شروع کردی ہے۔''

''خوش نصیب ہیں آپ۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے پھر کہا۔

وہ ہنسا، ''تم نے تو میرا نام ہی خوش نصیب خان رکھ دیا بھئی— تم ذرا اپنا نام تو بتاؤ کیا ہے؟''

''آزاد نام ہے میرا۔'' وہ بولا، ''اور میں ہوں بھی آزاد منش۔''

''اچھا تو بھئی آزاد!'' اس نے کہا، ''تم نے اپنا گھر بنایا کہ نہیں؟''

''کیوں نہیں جناب۔'' وہ بولا، ''یہ تو ضروری تھا بچوں کے سر چھپانے کے لیے اپنی چھت تو...'' وہ مسکرایا، ''یہ اور بات ہے کہ تیز بارش اور آندھی میں اس کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے، جیسے کہ آج کل!''

''آج کل؟'' اس نے اچنبھے سے پوچھا، ''یہ بارشوں کا زمانہ تو نہیں۔''

آزاد مسکرایا اور اس کے ہونٹوں پر ایک پُر اسرار معنی خیز تحریر ابھری، ''یہ تو بے موسم کی بارش ہوتی ہے اور نظر نہیں آتی مگر،'' وہ بولا، ''اس میں آنکھوں سے خون برستا ہے۔''

اسی وقت ٹیکسی رک گئی۔ سامنے راستہ بند تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دور تک فلیٹوں کی طویل فصیلیں کھڑی تھیں۔ سڑک پر اندھیرا تھا اور تھوڑی دور پر لگے ہوئے درختوں نے تاریکی کا نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ صرف گزرنے والی گاڑیوں کی روشنی سے لمحے بھر کے لیے وہاں اُجلی اور تاریک پرچھائیاں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتیں۔ کچھ کاریں اور دو ایک بسیں ٹیکسی سے آگے راستہ روکے ہوئے تھیں، دور نیم تاریکی میں کچھ سائے حرکت کر رہے تھے۔ اس نے کہا، ''شاید سڑک کھدی ہوئی ہے آگے— تعمیر کا کام جاری ہے۔''

آزاد نے کہا، ''تخریب کا بھی ہوسکتا ہے— آپ اس شہر میں کوئی بات پورے یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ ویسے اگر وہی بات ہے جس کا مجھے اندیشہ ہے تو...''

اس نے گھبرا کے کہا، ''کیسا اندیشہ— کوئی خطرہ تو نہیں؟''

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا، ''خطرہ بھی ہوسکتا ہے مگر اس سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

اس نے پوچھا، ''وہ کیسے؟''

کہنے لگا، ''جیب سے اپنا پرس نکالیے۔ اس کے بعد گھڑی اتار لیجیے، اگر کوئی قیمتی انگوٹھی وغیرہ پہن رکھی ہے تو وہ بھی— چیزوں کو رومال میں باندھ لیجیے اور بریف کیس بھی تیار رکھیے۔''

اس نے کہا، ''مگر کیوں؟''

آزاد نے کہا، ''آپ شاید اپنی صحت اور درازیِ عمر کے لیے صدقے اور خیرات پر یقین نہیں رکھتے۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ اس وقت اس راستے سے گزرنے والوں کو اسی نیک کام پر آمادہ کر رہے ہوں— کیا پتا؟''

اس نے کہا، ''تم تو مجھے ڈرا رہے ہو۔''

آزاد بولا، ''بالکل نہیں— میں تو آپ کو بغیر ڈرے زندہ رہنے کی ترکیب بتا رہا ہوں۔''

اس نے کہا، ''اچھا تم ذرا باہر جا کے تو دیکھو معاملہ کیا ہے؟'

آزاد نے کہا، ''اس کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں، معاملہ خود ہی یہاں تک پہنچ جائے گا۔''

اس نے پوچھا، ''کوئی دوسرا راستہ نہیں یہاں سے نکلنے کا؟''

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا، ''ہم ٹریفک کے بیچ پھنسے ہوئے ہیں جناب— ویسے بھی مصیبت سے نکلنے کے لیے سب سے آسان نسخہ یہی ہے کہ آپ اپنی ہر چیز کو دوسروں کی امانت سمجھیں۔ ویسے میرا یہ خدشہ غلط بھی ہوسکتا ہے۔ شاید انھیں اس وقت کسی بھی چیز کی ضرورت نہ ہو سوائے...''

''سوائے...؟'' اس نے پوچھا۔

آزاد نے کہا، ''سوائے گاڑی کے۔''

''یعنی...؟''

اس نے کہا، ''ہوسکتا ہے، وہ گاڑی کی تلاش میں ہوں۔''

''کس گاڑی کی تلاش میں؟''

''کسی بھی گاڑی کی۔'' آزاد نے کہا، ''انھیں ہر گاڑی قبول ہے، شرط یہی ہے کہ چاروں پہیے سلامت ہوں اور چال تھکی ہوئی نہ ہو۔''

''اگر یہی معاملہ ہے تو پھر کیا ہوگا؟'' وہ گھبرا گیا۔

آزاد نے اطمینان سے جواب دیا، ''آنے تو دیں، پھر ادب سے پوچھیں گے، بھائی صاحب کیا خدمت کی جائے آپ کی، اگر روپیا پیسا چاہیے تو یہ رہا اور اگر گاڑی کی طلب ہے تو یہ چابی حاضر ہے، چلیے سنبھالیے۔ پٹرول کی ٹنکی بھری ہوئی ہے اور ٹائر بالکل نئے ہیں۔ بس اتنا وقت ضرور دیجیے کہ ہم لوگ گاڑی سے اتر کے آپ کو خدا حافظ کہہ سکیں۔''

اس نے بوکھلا کے کہا، ''مگر میرا سوٹ کیس؟''

آزاد ہنسا، ''آپ بھی کمال کرتے ہیں، بھلا ڈوبتے ہوئے آدمی کو اپنا مال اسباب یاد رکھنا چاہیے۔''

اس نے جلدی سے گاڑی کا شیشہ چڑھا لیا۔

آزاد نے کہا، ''اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ گالی یا گولی جس پر ہمارا نام لکھا ہے، ہماری طرف آ کر رہے گی، یہ زمانہ ہی ایسا ہے۔''

اسی وقت ایک موٹر سائیکل سوار برابر سے گزرا اور آگے ٹریفک میں حرکت پیدا ہوئی۔

ٹیکسی والے نے موٹر سائیکل والے سے پوچھا، ''کیا بات تھی ـــ کہیں کلاشنکوف والے تو...؟''

موٹر سائیکل والے نے کہا، ''آگے چیکنگ ہو رہی ہے۔ شام کو ادھر فائرنگ ہوئی تھی۔''

وہ آگے بڑھ گیا۔

''اوہ، اچھا۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی۔ ذرا آگے پہرے داروں کا ناکا تھا۔ لمبے نسواری رنگ کے کوٹ والا ایک سنتری جس کے کالر اوپر اٹھے ہوئے تھے، بندوق اٹھائے ٹیکسی کے پاس آیا۔ اس نے منہ اندر کرکے پہلے ٹیکسی والے کو، پھر اسے گھورا، ''کدھر سے آ رہے ہو؟''

''ہوائی اڈے سے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے مختصر جواب دیا۔

سنتری نے پچھلی سیٹ کی طرف اُسے ایک بار پھر جھانک کے دیکھا اور پوچھا، ''ڈگی کے اندر کیا ہے؟''

''سوٹ کیس ہے بابو جی کا ـــ'' آزاد بولا۔

''سوٹ کیس میں کیا ہے؟'' پھر سوال آیا۔

''بم ہے۔'' ٹیکسی والے نے جل کے جواب دیا، ''سوٹ کیس کے اندر کیا ہوتا یار! بندہ باہر سے آ رہا ہے، ظاہر ہے کہ کپڑے لتے ہوں گے، پھر بھی۔''

سنتری ٹیکسی ڈرائیور کی گستاخی پر جھلا گیا تھا، بولا، ''زیادہ ٹر ٹر نہیں، بس اب شکل گم کرو۔''

گاڑی حرکت میں آئی تو اس نے کہا، ''تم نے تو اس وقت سنتری بادشاہ کو

ناراض ہی کر دیا تھا۔''

ٹیکسی ڈرائیور بولا، ''صاحب جی، یہ لوگ جان بوجھ کے ایسی باتیں کرتے ہیں، تنگ کرنے کو— یہ پکڑتے ہی ایسے لوگوں کو ہیں جنھیں نہیں پکڑنا چاہیے۔''

''کبھی تم بھی پکڑے گئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کئی بار۔'' آزاد نے جواب دیا۔

''کس نے پکڑا، انھوں نے؟''

اِنھوں نے یا اُنھوں نے، کچھ پتا نہیں، ہمیشہ یہ کارروائی اندھیرے میں ہوئی۔''

''پھر کیا کیا تمھارے ساتھ؟''

''کیا کیا— ایک بار ٹیکسی چھین لی اور دن بھر کی کمائی ہڑپ کر گئے۔''

''سب پیسے چھین لیے؟''

''نہیں سب نہیں، بس کرایہ چھوڑ دیا گھر جانے کے لیے۔''

''خیر اتنے رحم دل تو ہیں۔'' وہ ہنسا۔

آزاد نے کہا، ''ہونہہ رحم دل— جب گاڑی واپس ملی تو اس کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے، گولیوں سے چھلنی تھی اور اُس کی ڈگی میں ایک آدمی کی لاش تھی۔''

''لاش—؟''

''جی ہاں— لاش!'' آزاد نے کہا۔

''کس کی لاش تھی؟''

''میری نہیں تھی۔'' آزاد نے کہا، ''پھر بھی میری ہی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چکرا گیا۔

''مطلب یہ کہ مجھے اس مصیبت سے پیچھا چھڑانے کے لیے تقریباً مرنا ہی پڑا۔ گھر کا سامان بیچ باچ کے اور لوگوں سے قرضہ لے کے پھر سے جینا شروع کرنے کی ترکیبیں کیں۔''

''وہ بھلا ایسے کہاں چھوڑتے ہیں؟''

''لاش کا کیا بنا؟''

''محتاج خانے والے لے گئے وہ بھی بس مردوں کو لے جاتے ہیں دفنانے — یہ اچھی بات ہے کہ زندوں کو دفن کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

ٹیکسی اب ایک ایسی کھلی ہوئی سڑک پر چلی جا رہی تھی جہاں نسبتاً روشنیاں کچھ زیادہ تھیں۔ سارے شادی گھر، اسپتال، زچہ خانے، اسکول، مسجدیں اور امام باڑے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی تیزی سے ٹیکسی کو پیچھے چھوڑتی ہوئی آگے نکل جاتی۔ ایک راؤنڈ اباؤٹ پر بہت سی کاریں نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرتی ہوئی پاس سے گزر گئیں۔ اس نے کہا، ''بہت دن بعد گھر لوٹتے ہوئے ہر چیز بڑی اچھی لگتی ہے۔ راستے کا شور بھی اور ان سڑکوں کا اندھیرا بھی، اور ان پر پڑے ہوئے گڑھے —''

آزاد نے دور سے ایک گڑھے کو دیکھ کر ٹیکسی کی رفتار کو کم کرتے ہوئے کہا، ''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ — مگر اب گڑھے بہت ہو گئے ہیں، شور بہت بڑھ گیا ہے اور اندھیرا سڑکوں سے اتر کے گھروں تک...''

اس نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا، ''تمھارے کتنے بچے ہیں آزاد؟''

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا، ''دو لڑکے ہیں سر جی! خوش حال گھرانا ہے ماشاء اللہ۔ ایک کی عمر تیرہ سال ہے، دوسرے کی سترہ سال۔''

''اچھا۔'' اس نے کہا، ''پڑھتے ہوں گے؟''

''پہلے پڑھتے تھے۔'' آزاد نے کہا۔

''کیوں — اب کیوں نہیں پڑھتے؟'' اس نے پوچھا، ''کسی کام پر لگا دیا تم نے انھیں؟''

''کام!'' آزاد ہنسا، ''اب تو وہ بازار کے کام آ رہے ہیں۔''

''کیسا بازار؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہاں چیزیں خریدی اور بیچی جاتی ہیں۔'' آزاد بولا۔

اسی وقت ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور ایک کشادہ گلی میں داخل ہوئی جس میں دو منزلہ

مکانوں کی قطاریں تھیں۔ گلی میں بہت کم روشنی تھی اور مکانوں کی بالائی منزلیں اندھیری تھیں۔ اس نے علاقے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''شاید یہی میری گلی ہے۔''

آزاد نے گاڑی کی رفتار کم کردی اور مکانوں کے قریب سے گزرنے لگا تاکہ وہ انھیں پاس سے دیکھ سکے۔

''ان میں سے آپ کا گھر کون سا ہے؟'' آزاد نے پوچھا۔

اس نے کہا، ''سب گھروں میں اندھیرا ہے۔ آخر اب لوگ روشنیاں کیوں نہیں جلاتے۔ میں نے تو آنے سے پہلے گھر والوں کو اپنے پروگرام سے مطلع بھی کردیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گھر کی سب کھڑکیوں میں روشنی ہوگی اور میرے بچے دروازے پر کھڑے میرا راستہ دیکھتے ہوں گے — مگر یہاں تو دور دور تک سناٹا ہے اور اندھیرا۔''

آزاد نے کہا، ''شاید اوپری منزلوں میں کوئی نہیں، اس لیے کوئی بتّی روشن نہیں۔''

اس نے کہا، ''اچھا ذرا سامنے والے مکان کے سامنے ٹیکسی روکو، میں کسی سے پتا پوچھتا ہوں۔''

آزاد نے ٹیکسی روک دی۔ سامنے ایک دو منزلہ گھر تھا۔ لمبی کھڑکیاں، اونچی بالکونیاں اور محراب دار دروازہ — ہر کھڑکی، بالکونی اور دروازے پر اندھیرے کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے اندھیرے میں مکان کے دروازے کو ٹٹولا، کہیں گھنٹی کا بٹن، کوئی کنڈی، کوئی ہینڈل — کوئی چیز اس کے ہاتھ نہ آئی۔ آخر اس نے گھبرا کے دونوں ہاتھوں سے دروازے کو پیٹنا شروع کردیا، ''کوئی ہے، ارے کوئی ہے؟''

آزاد اسے دور سے دروازہ پیٹتے دیکھ رہا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کے اس کے پاس آیا اور بولا، ''اپنا ہاتھ زخمی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، شاید سب نیچے ہیں۔''

''نیچے، کتنے نیچے؟'' اس نے سوچا، ''نیچے والی منزل تو یہی ہے —''

''میرا مطلب ہے — تہ خانوں میں — زیرِ زمین —'' آزاد نے کہا۔

اس نے جھلّا کے دروازے پر زور سے اپنے بوٹ کی ٹھوکر ماری۔ اسی وقت غیر متوقع طور پر اندھیرے میں روشنی کا ایک ملگجا سا چوکھٹا نمودار ہوا۔ اس نے دیکھا۔ دروازہ

کھل گیا تھا۔ پھر ایک آدمی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے دروازے سے باہر نکلتے ہی اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا، ''میں چلنے کے لیے تیار ہوں مگر میرے بیٹوں کو کچھ مت کہو، ان کا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔''

ٹیکسی والا آگے بڑھا اور اس کے شانے کو جھنجھوڑ کے بولا، ''ہوش میں آؤ بھائی، ہم تو ان کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں، اس میں ان کے بچے رہتے ہیں۔''

وہ آدمی یہ سنتے ہی واپس اپنے گھر کے اندر چلا گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا، ''یہاں سب گھر ایک جیسے ہیں اور سب میں بچے رہتے ہیں۔''

اس نے کہا، ''مگر مجھے تو اپنا گھر ضرور ڈھونڈنا ہے۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا، ''آپ کو یقین ہے کہ آپ کا گھر یہیں ہے؟''

اس نے جواب دیا، ''ہاں بھئی اس میں شک کی کیا بات ہے۔ اس نے گلی میں نظر دوڑائی۔ سارے گھر اسے اپنے گھر لگ رہے تھے۔ اس نے آزاد سے کہا، ''بس اب تم جاؤ میرا خیال ہے اگلا گھر میرا ہے یا شاید اس سے آگے والا۔''

آزاد نے کہا، ''ٹھیک ہے۔'' پھر اس نے ٹیکسی سے سامان اتارتے ہوئے تنبیہ کی، ''مگر زیادہ دیر نہیں رکیے گا کھلے میں — یہاں موسم کا کچھ بھروسا نہیں۔ گرج چمک کے ساتھ اولے گر سکتے ہیں۔ بارش بھی ہوسکتی ہے، ذرا دیر میں کچھ بھی ہوسکتا ہے — اور اگر میری ضرورت پڑے تو بلاتکلف میری طرف ادھر آجایئے گا، میں پیچھے ہی رہتا ہوں۔'' آزاد نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''پیچھے کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''پیچھے والے قبرستان میں۔'' آزاد اطمینان سے بولا، ''میری قبر کا نمبر تین سو تین ہے!''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

آزاد ہنس کے بولا، ''چلیے قبر نہیں گھر کہہ لیجیے، مگر آج کل دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ یہ بات میں نے اپنے گھر کے دروازے پر بھی لکھ کے ٹانگ رکھی ہے، مگر میری

بیوی کو یہ بالکل پسند نہیں۔"

"اور لڑکوں کو؟"

"لڑکے!؟" آزاد بولا، "وہ تو کب سے بڑے گھر کے باسی ہیں جہاں ان کے دام مقرر ہیں۔ میں انھیں چھڑا سکتا ہوں، مگر مجھے پتا ہے وہ پھر دھر لیے جائیں گے، غلاموں کے بازار کے لیے اور نیلامی کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"

کان نہیں بولتے

میرے کان نہیں بولتے۔ آپ کہیں گے، کان کب بولتے ہیں لیکن میں نے انھیں ہمیشہ بولتے پایا۔ رات میں جب میں بے خبر سو رہا ہوتا ہوں تو وہ اچانک بولنا شروع کر دیتے ہیں اور آوازیں بارش کی تیز پھوار کی طرح مجھے سر سے پاؤں تک بھگو دیتی ہیں۔

آوازیں— جی ہاں، میری سنی ہوئی تمام آوازیں اچھل اچھل کر میرے کانوں سے باہر نکل آتیں، ساری باتیں۔ صبح سے شام تک کی سب آوازیں جو دن بھر میرے کانوں میں ذخیرہ ہوتی رہتیں۔ اچانک یوں باہر آجاتیں جیسے سماعت کا پیالہ چھلک جائے۔

میں اکثر یہ بات اشاروں میں اپنے دوست سے کہتا ہوں جو سن سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا۔ وہ جواب میں بس مسکراتا اور اپنے سامنے رکھے ہوئے کسی نامکمل گل دستے کو اپنی خوب صورت انگلیوں سے سنوارنے لگتا۔ الیاس پھول والا پھولوں کی اس بڑی سی دکان کا مالک تھا جو میرے فلیٹ کے سامنے واقع اسپتال کے زنانہ وارڈ کے مرکزی دروازے کے برابر سجی ہوئی تھی۔ گاہک آتے اور کوئی اچھا سا گل دستہ چن کر اسپتال کے اندر چلے جاتے۔ دکان پر الیاس چپ چاپ بیٹھا گل دستوں کو سنوارتا رہتا اور گاہکوں سے بات چیت کا کام اس کے ملازم لڑکے کرتے۔

میں حیران ہوتا تھا کہ جب کان نہیں بولتے تو دنیا کتنی اداس اور کتنی ساکت لگتی

ہے۔ زندہ کانوں میں تو آوازوں کے گلاب سجے ہوتے ہیں۔ مگر پھول والے کے لیے دنیا کیا ہے۔ مٹی کے وسیع وعریض فریم میں جڑی ہوئی خاموشی کی تصویر۔ یا پھر گونگی پتلیوں کا تماشا۔

مگر مجھے آوازیں سونے نہ دیتیں۔ میرے کان مجھے جگا دیتے۔ محلے بھر کی آوازیں مجھے رہ رہ کے پکارتیں۔

''تمھیں اڑ کے دکھاؤں اماں — گلی میں — بالکونی سے اُڑ کے جاؤں گا اور پلک جھپکتے میں سامنے والے پیڑ سے اچھے اچھے امرود توڑ لاؤں گا۔ یا پھر پان کی دکان سے برف میں لگے پان لے آؤں، ٹھنڈے اور میٹھے۔''

یہ گڈو کی آواز تھی۔ وہی آٹھ نو برس کا گول مٹول سا چلبلا لڑکا۔ میرے پڑوس میں تیسری منزل کے فلیٹ میں رہنے والا۔ وہ روز شام کو اپنے گھر کی بالکونی میں کھڑے ہوکر اپنے دونوں ہاتھ یوں پھیلاتا جیسے اڑنے کو پر تول رہا ہو۔ پھر وہ سامنے پھیلے ہوئے نیلے آسمان پر نظر دوڑاتا اور پکار کے کہتا، ''میں تو کبوتر بن گیا ہوں اماں۔'' ''ارے، مگر بھئی ابھی اپنے کبوتر کو اڑنے مت دینا بیٹا!'' اماں کی مسکراتی ہوئی آواز۔

میں کروٹ بدلتا تو دوسری آوازیں بھی میرے گرد پھیل جاتیں۔ میرے بستر کے چاروں طرف۔ میں کبھی تکیہ اٹھاتا تو اس کے غلاف میں سے پیانو کی ایک تیز دھن تڑپ کے باہر نکلتی اور پیانو پر گایا جانے والا گیت یوں فضا میں ابھرتا جیسے بادلوں کا پردہ سرک جانے سے اچانک سورج کی کوئی چمکیلی کرن کمرے کی دیواروں کو سوتے سے جگا دے۔

اس عمارت کی چوتھی منزل کے دوسرے فلیٹ میں ماسٹر دل نواز ہر صبح اپنے پیانو اسکول میں لڑکیوں کو موسیقی کا درس دیتا ہے۔ سُروں کے پھول کھلاؤ اور خوشیوں کے گیت بکھیرو، بچیو! ہر بار کوئی گیت پیانو کے کلیدی تختے پر ان کی خوب صورت انگلیوں سے مس ہوکر باہر نکلتا ہے تو ہر طرف خوشی سی پھیل جاتی ہے۔

خوشبو، پھول، پودے اور میٹھے پھلوں والے شجر۔ تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ نعمت ہیں یہ تصویریں بھی۔ خطاطی کے نمونے، کوئی آنکھ والا کہتا ہے نقاش عاشقین سے۔ اور ہم نے بہت سی چھتیں اور دیواریں سنگی ستون تمھارے لیے منتخب کر رکھے ہیں۔ تم

ان پر اسمِ اعظم سجاؤ گے۔ نقاش کے بے شمار چاہنے والے جو اس کے اسٹوڈیو میں آتے جاتے رہتے اور اللہ کی نعمتوں کا اعتراف کرتے۔ نقرئی آوازیں، گل رنگ چہرے، شمع کی طرح فروزاں لوگ، زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری۔

سوتے میں میرا ہاتھ لگ جانے سے میز پر رکھی ہوئی کوئی کتاب کھل جاتی اور اس کے اوراق میں سے بے شمار ننھی ننھی آوازیں جگنوؤں کے قافلے کی صورت میں باہر نکل پڑتیں۔ یہ وہ بچے تھے جو اس عمارت کے نچلے حصے میں واقع اسکول میں پڑھتے تھے اور روز سویرے سویرے ان کی اجتماعی دعا سے فضا میں نور بکھر جاتا اور یہ نور میرے کمرے کو بھی روشن کر دیتا۔ جیسے صبح ہو گئی ہو۔

''تو صبح کیسے لکھتے ہیں انکل۔ صاد سے یا سین سے؟'' ایک اور پیاری آواز۔ وہ ننھی فاختہ جو اسکول سے واپسی پر مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آتی تھی۔

''میری لکھائی بہت گندی ہے انکل۔ اسکول میں ٹیچر بھی ہمیشہ میرے نمبر کاٹ لیتی ہیں۔ آپ نے جو مضمون مجھے لکھوایا تھا باغ کی سیر، اس پر مجھے شاباش ملی اور بڑا سا اسٹار بھی۔ تو بتایئے نا انکل صبح کیسے لکھتے ہیں۔ یہ صاد کتنا مشکل ہوتا ہے۔ صبح کو سین سے کیوں نہیں لکھتے، صبح تو صبح ہوتی ہے، صاد سے لکھیں یا سین سے۔ کتنی اچھی ہوتی ہے صبح۔ اور صبح باغ کی سیر کتنی اچھی لگتی ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول، ہری ہری گھاس اور تتلیاں۔ پتا ہے امی نے گھر میں بھی اپنا چھوٹا سا باغ لگا رکھا ہے۔ آپ آئیے نہ کسی دن ہمارے یہاں۔ اتنے سارے پھولوں والے پودے ہیں۔ مگر پتا ہے، امی کبھی کوئی پھول توڑنے نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں، نہیں منی، پھول رونے لگے گا۔ بھلا کہیں پھول بھی روتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں پھول ہنسنے کے لیے بنے ہیں۔''

''ایک مزے کی بات بتاؤں، انھوں نے پھولوں والے پودوں کے بیچ میں ایک کانٹوں والا پودا بھی لگا رکھا ہے۔ اس پر کبھی کوئی پھول نہیں آتا مگر امی کہتی ہیں کہ ایک دن وہ بھی ہنس پڑے گا، جب کوئی خوشی کی خبر آئے گی۔ ایسا کب ہوگا انکل۔ پودے کس بات سے خوش ہوتے ہیں؟''

''خوش ہونا ہے تو اندر آئیے اور اپنی مرضی کا آئیٹم خریدیے۔'' ایک اور آواز، ''ذرا دیکھیے یہ تصویریں — یہ تراشیدہ سنگی نقش — سجاوٹ کی خوب صورت اشیا — مصوری کے شاہکار۔ آپ کو یہاں ہر وہ شے ملے گی جس کی آپ کو تلاش ہے۔'' گفٹ کارنر کے مالک دانش علی اپنی دکان کا تعارف کرانے میں بڑی فراخ دلی سے خوب صورت فقرے استعمال کرتے ہیں۔ ''ذرا دیکھیے، یہ فن پارے نہیں یہ تو آئینے ہیں۔ ہماری پہچان کے خاکے، ہمارے چہرے، ہماری تاریخ کے اوراق، ہمارا تعارف، وقت کے رحل پر رکھی ہوئی ماضی کی سنہری کتاب، قرآنی آیتوں کے طغرے، جالی دار چوبی تختیاں، مٹی کے کھلونے، دھات کے اوزار اور مجسمے۔'' پھر اچانک ٹوٹے ہوئے ہاتھ والی رقاصہ کھلے دریچے سے کمرے میں کود آتی ہے۔ چھم چھم چھم — تو لاکھ چلے رے گوری تھم تھم کے، پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے — دیوار پر ٹنگا ہوا کیلنڈر، ہوا کے ایک سرکش جھونکے سے زندہ ہو کے پھڑ پھڑاتا ہے اور اس پر چھپی ہوئی پری چہرہ کی تصویر بول پڑتی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے جیسے گیت کے بول ابھرتے ہیں۔ مگر کہیں تصویر بھی گا سکتی ہے؟ کیوں نہیں، اور میں جانتا ہوں نیچے والے ایک فلیٹ میں اقبال بانو مستقل پڑاؤ جمائے رکھتی ہیں۔ وجہ، میرے دوست غنی جو اسٹاک مارکیٹ میں حصص کا کاروبار کرتے ہیں اور جیسے ہی مندی کے لمبے عرصے بعد بازار کے بھاؤ چڑھتے ہیں، ان کے گھر کی سب کھڑکیاں کھل جاتی ہیں اور ہر کھڑکی سے اقبال بانو آدھے آدھے دھڑ سے باہر لٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔

جب میرے کان باتیں کرتے ہیں تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ اور بھئی اپنے زندہ ہونے کا احساس کسے اچھا نہیں لگے گا، خاص طور پر جب آدمی کسی جنگ سے زندہ بچ آیا ہو اور میں ایسی ہول ناک جنگ سے لوٹ کے آیا تھا جو پہاڑوں میں لڑی گئی تھی۔ اور میں لوٹ آیا۔ مگر وہیل چیئر میں۔

میں جنگ کی ساری ہول ناکیوں کو بھول گیا تھا اور فلیٹوں کے اس کمپلیکس میں بڑے مزے سے رہا۔ اوپر فلیٹ تھے اور نیچے دکانیں۔ اور سامنے زنانہ اسپتال۔ ایک ملازم مجھے وہیل چیئر سمیت اوپر نیچے لے جانے پر مامور تھا۔ میں پڑوسیوں سے گھل مل گیا تھا اور

خوش تھا۔ میرے کان بولتے تھے اور آوازیں میرے کمرے میں تتلیوں، بلبلوں اور فاختاؤں کی طرح چکر لگاتی تھیں مگر کبھی کبھی پڑوس کے کسی گھر میں کوئی بچہ زور زور سے رونے لگتا اور مجھ پر کوے حملہ کر دیتے۔ پھر میں اسپتال کے دروازے پر واقع پھولوں کی دکان میں چلا جاتا۔ الیاس پھول والے کے پاس۔ وہ سن سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا مگر اس کی سب باتیں سمجھ میں آتی تھیں۔ جس دن اس کے سب گلاب اور گیندے بک جاتے، وہ بہت خوش ہوتا۔ مجھے روتے ہوئے بچے اچھے نہیں لگتے۔'' ایک دن میں نے کہا، ''مگر مجھے اچھے لگتے ہیں۔'' اُس نے اشاروں میں بتایا۔ مجھے تعجب ہوا۔ بھلا وہ اُن کی آوازیں کیسے سن سکتا تھا۔ الیاس پھول والا مسکرایا، ''مجھے پتا چل جاتا ہے جب نوزائیدہ بچے اسپتال کے اندر روتے ہیں، میرے سب گل دستے بک جاتے ہیں۔'' وہ گلابوں کو نئے سرے سے سنوارنے لگا۔

الیاس پھول والے سے یہ میری آخری ملاقات تھی کیوں کہ دوسری شام ابھی میں کھلی کھڑکی سے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کو اندھیرے کی دہلیز پار کرتے دیکھ رہا تھا کہ اسپتال کے سامنے والی سڑک پر ایک دم سائرن بجنے لگے اور ایمبولینس ذبح ہونے والے جانوروں کی طرح چیخنے لگیں۔ کہیں دور سے جہاں خون کی بارش ہوئی تھی، زخمی اسپتال لائے جا رہے تھے۔ پھر اچانک صور پھونکا گیا اور زمین شق ہوگئی اور پتھروں اور انگاروں کی بوچھار شروع ہوگئی اور میں نے خود کو اپنی وہیل چیئر سمیت دھوئیں سے بھرے ہوئے کنویں میں ڈوبتے دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تیسری منزل کے فلیٹ کی بالکونی سے کوئی کبوتر کب کالے آسمان کی طرف پرواز کر گیا۔ ماسٹر دل نواز کے پیانو اسکول میں تربیت پانے والی لڑکیاں اپنے گیتوں سمیت کن دیواروں میں زندہ دفن ہوگئیں۔ نقاش عاشقین کی تصویروں میں ساحل پر کھڑی کشتیوں پر کب خون کے بادبان تن گئے اور بچوں کے اسکول میں شمع کی صورت روشنی پھیلانے کی دعائیں مانگنے والے ننھے فرشتے کب آگ کے شعلوں میں گھر گئے۔ پھر جب گملوں میں لگے پودوں کے پھول دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے تو منّی کہاں تھی اور گفٹ کارنر کی ٹوٹے ہاتھ والی رقاصہ چھم چھم کرتی

مُردوں کی کن بستیوں کی طرف نکل گئی۔ مجھے کچھ بھی پتا نہیں چلا۔ اور اب جب میں اسپتال میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد اپنے گھر واپس لوٹا ہوں تو آوازیں معدوم ہیں اور میرے کان نہیں بولتے۔ میں جنگ پیچھے چھوڑ آیا تھا مگر جنگ میرا پیچھا کرتی میرے گھر تک پہنچ گئی۔ میں یہ بات الیاس کو بتانا چاہتا تھا، پھول والے کو، مگر وہ دکان پر موجود نہیں۔ دھماکے کی شام... مگر اس کی دکان کھلی ہے اور اس کی جگہ اس کا بیٹا۔

میں چاہتا ہوں کہ اس سے کچھ پوچھوں، مگر وہ مصروف ہے۔ میں لوگوں کو گل دستے خریدتے دیکھتا ہوں۔ اور پھر میرے اندر کہیں دور آوازیں ابھرتی ہیں۔ اسپتال کے اندر نوزائیدہ بچوں کے رونے کی آوازیں۔ اور خاموشی کے فریم میں جڑی ہوئی زندگی کی گونگی تصویر اچانک پھر سے بول پڑتی ہے۔ میں حیران ہو جاتا ہوں۔ میرے کان...!

شب چراغ

''تو آنکھ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی ہے۔'' مقرر صاحب کہہ رہے تھے اور مذاکرہ جاری تھا— رات کی آنکھیں— تاریکی کو چیرنے والی بینائی کی شعاعیں۔

میں اور فرید باہر نکل کے سبزہ زار پر واقع چائے خانے میں آبیٹھے۔ مقرر کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ وہ اس ٹیکنالوجی کے بارے میں معلومات کا خزانہ لٹا رہے تھے جو اندھیرے میں آنکھ کو روشن کر دیتی ہے۔

فرید نے کہا، ''میں تو تقریر سننے کے بجائے اس بلّی کو دیکھتا رہا۔''

''کس بلّی کو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا، ''بلّی تو لگتا ہے تمھارے اعصاب پر سوار ہوگئی ہے۔''

''تم نے نہیں دیکھی؟'' وہ بولا، ''سامنے ہی تو بیٹھی تھی، صدر صاحب کی میز کے نیچے۔ چمکیلے کالے رنگ کی بلی جس کے دونوں کان سفید تھے اور دُم کا کچھ حصہ بھی۔ اس کی آنکھیں دیکھی تھیں تم نے، بالکل پیلی— میرے گھر میں بھی ایسی ہی بلی ہے۔ یار یہ بلیاں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی ہیں۔''

میں نے سوچا، اب یہ بہت دیر تک بلی کی پُراسرار خصوصیات کے بارے میں بور کرے گا— ایک لیکچر اندر، ایک باہر۔

جب سے فرید کی شادی ہوئی تھی اور اس کے کمرے میں اس کی بیوی نے قدم رکھا تھا، بلی نے بھی اس کے گھر میں ڈیرہ جما لیا تھا۔

وہ کہتا، ''یار اس کی بلی بھی بہت پُراسرار ہے بالکل اس کی طرح — اس کی آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح چمکتی ہیں اور رنگ بدلتی ہیں۔''

فرید اخباری رپورٹر تھا اور عموماً اس کی شامیں باہر گزرتی تھیں۔ خبر کے تعاقب میں — یا پھر... مگر یہ بڑے راز کی بات ہے۔

آج وہ خاص طور پر اس مذاکرے میں شریک ہونے آیا تھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لایا تھا۔ وہ ان دنوں اندھیرے میں دیکھنے میں مدد دینے والے آلات کے بارے میں ایک رپورٹ پر کام کر رہا تھا۔

میں نے بلیوں کے بارے میں اس کی تحقیق کے نئے پہلوؤں پر دھیان دینے کے بجائے وہاں سے اٹھ جانے میں عافیت جانی۔

''اب چلتا ہوں بھئی۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں اندر جاتا ہوں۔'' وہ مذاکرے کے ہال کی طرف چلا گیا۔

رات میں گھر پر بیوی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے میں نے کہا، ''فرید کا خیال ہے کہ بلی اس کی نگرانی کرتی ہے۔''

''کیا؟'' بیوی نے ہنس کر میری طرف دیکھا، ''بلی کیوں؟''

''بس۔ اس کا کہنا ہے کہ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے، وہ یا تو اسے اپنے پہلو میں لحاف کے اندر خُر خُر کرتا پاتا ہے یا پھر اسے کہیں دور بیٹھے اپنی طرف گھورتے ہوئے۔ اندھیرے میں بھی وہ اس پر نظر رکھتی ہے۔''

''تو وہ اسے پھنکوا کیوں نہیں دیتا بھئی — اگر وہ اس سے اتنا ڈرتا ہے تو؟'' بیوی نے سوال کیا۔

''پھینک نہیں سکتا۔'' میں نے جواب دیا، ''وہ اس کی بیوی کی چہیتی بلی ہے۔''

دوسرے دن پھر ملاقات ہوئی تو فرید نے دوبارہ اپنی 'بلی کہانی' کا وہیں سے آغاز کیا۔ تمھیں پتا ہے، اس کی آنکھوں میں خاص صلاحیت ہوتی ہے۔ اندھیرے میں اس کی پتلیاں خوب پھیل جاتی ہیں اور۔'' میں نے اکتا کے کہا، ''بلی کو گولی مارو یار، کوئی اور بات کرو۔''

بولا، ''گولی کیسے مار سکتا ہوں۔ بیوی جان سے مار دے گی مجھے، تمھیں پتا نہیں، وہ کہتی ہے کہ اس میں تو اس کی جان ہے!''

میں نے کہا، ''آخر تمھارا کیا مسئلہ ہے— بلی سے ڈرتے ہو؟''

''ڈرتا تو نہیں— اس سے چھپتا پھرتا ہوں۔'' فرید نے جواب دیا، ''جب بھی میں رات میں دیر سے گھر پہنچتا ہوں اور لاکھ احتیاط کرتا ہوں کہ کسی کو پتا نہ چلے اور سوتے میں بیوی کی آنکھ نہ کھلے۔ یہ کم بخت بلی اچانک کہیں سے ٹپک پڑتی ہے۔ جیسے ہی دروازہ کھولو، یہ سامنے موجود— پھر سونے کے کمرے میں گھسو تو بیوی بھی جاگتی ملتی ہے۔''

''تو گھر دیر سے کیوں جاتے ہو؟ ویسے بھی شادی کے بعد آدمی کو کچھ تو شریفانہ طور طریقے اختیار کرنا چاہییں نا۔'' میں نے اسے جلانے کے لیے کہا، ''شادی کیوں کی تھی؟''

''شادی— '' وہ افسردگی سے بولا، ''یار میں کب کرنا چاہتا تھا، تم تو جانتے ہو، مگر اماں— انھیں بڑی جلدی تھی، اپنی چہیتی بھانجی کو بہو بنانے کی۔''

اور میں جانتا تھا، فرید کی راتیں کیسے گزرتی تھیں۔

''تو تم نے اب تک ہتھیار نہیں ڈالے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا کروں یار— '' وہ بولا، ''کلب میں دیر ہو ہی جاتی ہے۔ لوگوں سے ملنا ملانا پڑتا ہے۔ خبر ایسے تھوڑا ہی ملتی ہے— دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے لوگوں کے ساتھ۔''

''برے لوگوں کے ساتھ۔'' میں نے پھر وار کیا۔

''خبر تو برے لوگوں سے ہی ملتی ہے۔ کاش تم میری جگہ ہوتے۔'' فرید بولا،

''شکر ہے کہ نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

فرید مسکرایا، ''اسی لیے تو کہتا ہوں، تمھیں کیا پتا۔ میں وہاں دوستی کا مشروب

پینے تھوڑا ہی جاتا ہوں، البتہ کاغذی توتوں کی فال، ضرور مزے دار لگتی ہے۔''

''دوستی کا مشروب تو سمجھ گیا، وہ کڑوی کسیلی آگ جو آدمی کی انا کو جلا کر رکھ کر دیتی ہے مگر کاغذی توتوں کی فال؟''

فرید نے جواب دیا، ''کاغذی توتوں کی فال سے رقم ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہے۔ اب تم اسے جوا مت کہنا۔ یہ بڑا چھچھورا لفظ ہے اس خوب صورت ہنر کے لیے۔''

''اور رات کی رانی؟'' میں نے اسے سوالیہ نگاہوں ٹٹولا۔

''شی — '' فرید نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''کچھ چیزیں اگر چھپی رہیں تو اچھا ہے۔ تم تو جانتے ہو!''

میں نے کہا، ''بے شک اندھیرا بڑا عیب پوش ہے۔''

فرید ہنس کے بولا، ''اب میں اسی بات پر تو تحقیق کر رہا ہوں کہ کیا واقعی اندھیرا سب کچھ چھپا لیتا ہے، مگر وہ آنکھیں جو اندھیرے میں سب کچھ دیکھ سکتی ہیں۔ تمھیں پتا ہے پرسوں رات کیا ہوا، اسمگلروں کا ایک گروپ گھپ اندھیرے میں کشتی سے ساحل پر سونا اتارتے ہوئے پکڑا گیا۔ اندھیرے کا پردہ انھیں نہیں بچا سکا۔''

''کیسے بچائے گا۔'' میں نے کہا، ''تم نے اس دن مذاکرے میں نہیں سنا، ایسے میں اندھیرے میں دیکھنے میں مدد دینے والی خصوصی عینکیں اور دوربینیں کام آتی ہیں۔''

''مگر میرا تجربہ ہے۔'' فرید بولا، ''بہت سی آنکھیں ان عینکوں کے بغیر بھی اندھیرے میں دیکھ سکتی ہیں۔ شاید کوئی روحانی عینک ہوتی ہے ان کے پاس۔'' پھر وہ لمحے بھر کر رُکا۔ اس کے بعد بولا، ''یار تمھیں اشفاق احمد کا وہ افسانہ یاد ہے جس میں ایک ایسے نابینا اتالیق کا ذکر ہے جنھیں علمِ ہندسہ کے سوالات حل کرنے کے لیے بس احساس کی آنکھ کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایک شخص جیومیٹری کا ایک مسئلہ لے کُر ان کے پاس آیا تو انھوں نے کہا کہ وہ اپنی انگلی سے ان کی کمر پر حل طلب زاویہ بنا دے تاکہ وہ اس کی الجھن دور کرسکیں۔ گویا اندر کی آنکھ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ کیا بات تھی اس بابے کی — کیسا پہنچا

ہوا، بزرگ تھا۔''

''اچھا تو...'' میں نے کہا، ''اب تمھیں روحانی آنکھ والے درویش یاد آنے لگے— آخر ماجرا کیا ہے؟''

اچانک فرید نے اپنا موبائل فون اٹھایا جو بجنے کے بجائے تھرتھرا رہا تھا۔

میں نے کہا، ''موبائل کی گھنٹی بھی چھپاتے ہو— اسے بجنے نہیں دیتے۔''

فرید ہنسا، ''ضروری پیغام ہے یار، لہٰذا اب چلا۔''

میں نے پوچھا، ''پھر وہی دوستی کا مشروب اور کاغذی توتوں کی فال— یا پھر رات کی رانی، آج پھر؟''

''یار اس کی آواز میں جادو ہے۔'' وہ بولا، ''تمھیں تو پتا ہے مگر تم ٹھہرے سدا کے بھگوڑے۔'' اور وہ چلا گیا۔

میں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور سوچا، ''عجب باگڑ بلاّ ہے۔ مجھے تو اس کی بیوی کی فکر ہے۔ بے چاری کے دن رات کیسے گزرتے ہوں گے۔''

شام کو بیوی کے ساتھ ٹی وی دیکھتے ہوئے مجھے پھر فرید کا خیال آ گیا۔ میں نے پوچھا، ''یہ بتاؤ بیویوں کو اپنے شوہروں کی بری حرکتوں کا کیسے علم ہو جاتا ہے؟''

''اچھا— '' میری بیوی نے مسکرا کے مجھے دیکھا، پھر بولی، ''مگر مجھے تو آج تک پتا نہیں چلا۔''

''پھر تمھارا الارم کلاک خراب ہوگا۔'' میں نے ہنس کر کہا، ''فرید کا خیال ہے کہ اس کی بیوی تو اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی ہے۔ عورت ہے کہ بلی؟''

''اچھا اسی لیے وہ بلی سے عاجز رہتا ہے۔'' میری بیوی پھر مسکرائی، ''بلی کیا ہے اس کی بیوی کا ریموٹ کیمرہ ہے جیسے۔''

میں نے کہا، ''وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ جب اس کی بیوی کبھی اپنے میکے چلی جاتی ہے تو بلی کو اس پر نظر رکھنے کے لیے چھوڑ جاتی ہے اور واپسی پر بلی کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے سارے کرتوت دیکھ لیتی ہے۔''

''بلی کو الٹا گھما کے۔'' میری بیوی زور سے ہنسی، ''آپ لوگ بھی کیا باتیں کرتے ہیں۔ الیکٹرانک دور کے شکی خاوند!''

ہفتے بھر بعد فرید سے ایسے ملاقات ہوئی جب وہ اپنی کار کی ڈگی سے پلاسٹک کا ایک کالا تھیلا نکال رہا تھا۔

میں نے پوچھا، ''کیا ہے اس میں، کہیں بلی تو نہیں جسے آج موقع دیکھ کر کسی گٹر کے حوالے کرنے آئے ہو؟''

''نہیں۔'' فرید نے کہا، ''اس میں تو میلے کپڑے ہیں، ڈرائی کلینز کو دینے لیے۔ بلی تو داغِ مفارقت دے گئی اچانک — اسے پھنکوا دیا۔''

''تم نے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں خود بیگم صاحبہ نے۔'' اس نے جواب دیا، ''ہماری بڑی لڑائی ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ اُس رات جب میں رات گئے گھر لوٹا تو...''

''تو — '' میں نے اس کا جملہ کاٹ دیا، ''بیوی پیچھے پڑ گئی ہوگی یقیناً دیر سے آنے پر اور...''

''نہیں۔'' فرید نے پھر سے کہانی کا سلسلہ جوڑا، ''اس نے تو کچھ نہیں کہا، مگر پھر میں کسی وقت رات میں غسل خانے جانے کو اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بلی نے میرا کوٹ جس کے کالر میں ایک پھول بھی اڑسا ہوا تھا، کرسی سے نیچے گرا دیا ہے اور اس پر خوب مزے سے پھیل کر بیٹھی ہے۔ شاید اس کمینی نے اسے گیلا بھی کر دیا تھا۔ مُوت مات کے، سچ مانو یہی ہوا۔ میں نے صبح اٹھتے ہی بیوی سے کہا کہ اس کی بلی مجھے پسند نہیں کرتی، میرے خلاف کینہ رکھتی ہے، پکی دشمن ہے میری — اور اب اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ میں اسے بوری میں بند کر کے کسی نالے والے میں پھینک آؤں۔ بس اس بات پر ہماری خوب لڑائی ہوئی لیکن پھر پرسوں رات جب میں گھر گیا تو خلافِ توقع بہت دیر تک بلی نظر نہیں آئی۔ آخر میں نے پوچھا آج وہ تمھاری بدشکل ہم جولی نظر نہیں آرہی؟ بیوی نے مجھے غصے سے دیکھا اور بولی، آج کیا وہ اب کبھی یہاں نظر نہیں آئے گی، کیوں کہ میں نے اسے مالی

کے ذریعے کہیں دور پھنکوا دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں گھس گئی!''

میں نے کہا، ''چلو اچھا ہوا جان چھوٹی اس جاسوس بلی سے۔ اب تو خوش ہو؟''

''پتا نہیں۔'' فرید بولا، ''پھر لڑائی تو نہیں ہوئی حالاں کہ اب بھی مجھے رات میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔''

پھر ایک دن میں گھر پر ہی تھا کہ فرید آ گیا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور بیوی کو بتایا کہ فرید آیا ہے ذرا چائے بنا دو۔

چائے آئی تو فرید نے کپ اٹھایا اور چمچے سے شکر ملاتے ہوئے بولا، ''یار ایک بلی چاہیے مجھے کہیں سے، ذرا اچھی نسل والی ہو— سیامی یا پھر ایرانی!''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا، ''کیا بک رہے ہو— پھر بلی؟''

''ہاں یار۔'' وہ بولا، ''میں اس کی بلی واپس لانا چاہتا ہوں۔''

''مگر تم تو کہتے تھے...'' میں نے پوچھنا چاہا۔

''بات یہ ہے...'' اس نے کہا، ''میں پچھلے دنوں وہاں گیا تھا۔ رات کی رانی...''

''اچھا تو...'' میں نے اندازہ لگایا، ''گھر میں ایک بار پھر مہا بھارت...''

''نہیں، یہ بات نہیں۔'' وہ بولا، ''میں نے دیکھا کہ اس کے پاس بھی ویسی ہی بلی ہے۔''

''بلی اور اس کے پاس— وہ کہاں سے آئی؟'' میں نے سوال کیا۔

فرید نے کہا، ''میں نے بھی اس سے یہی پوچھا تھا۔ وہ بولی، یہ تو ہمیشہ سے میرے پاس ہے— میری بلی رانی۔ اکیلی جو رہتی ہوں، کوئی تو پاس ہو۔ تم لوگوں کا کیا ہے، کبھی آتے ہو، کبھی نہیں آتے۔''

فرید نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''پھر اس رات جب میں گھر واپس گیا اور بستر پر لیٹا تو مجھے نیند نہیں آئی، میری بیوی پاس لیٹی تھی۔ وہ بہت دیر تک چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی پھر جیسے اس کی آنکھیں میرے سینے میں دھڑکنے لگیں۔ اس نے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور آنکھوں میں جھانک کر بولی، آج پھر وہاں گئے

تھے نا؟ میں حیران ہوگیا۔ اسے تو سب کچھ پتا تھا ہمیشہ کی طرح۔ میں نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا، میں تمھاری بلی واپس لے آؤں گا— سوری، میری وجہ سے تم اکیلی ہوگئیں۔''

''اکیلی؟'' وہ مسکرائی، ''آج تمھیں اس کا خیال آیا فرید۔'' پھر وہ ہولے سے بولی، ''مگر میں لڑوں گی نہیں—''

''بس یار اس کے لیئے بلی!''

''اور رات کی رانی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے ہاں— '' فرید نے لمحے بھر کو سوچا پھر بولا، ''یار آج کلب میں کھانے کے بعد اس کے گانے کا پروگرام ہے۔ آج تم بھی آؤ نا، بہت پوچھتی ہے تمھیں۔ تم آؤ گے تو میں تمھارے ساتھ ہی اٹھ آؤں گا۔''

شام کے وقت گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے اپنی بیوی کو بتایا، ''لو بھئی! بلی نے تو کمال کر دکھایا۔ اس نے فرید اور اس کی بیوی کے درمیان کے سب فاصلے مٹا دیے۔ فرید گھر بھی جلد لوٹنے لگا ہے اور آج اس نے دوستوں کو کھانے پر بلایا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میری بیوی نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر مسکرا کر بولی، ''مگر گھر کی چابی ضرور اپنے ساتھ لے جایئے گا۔''

میں نے جاتے جاتے ایک بار پھر پلٹ کے اسے دیکھا، اس کی آنکھوں میں کچھ عجب سے روشنی تھی۔

پری گُل

جس وقت وہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے سامان اٹھائے سفر پر نکلے، پری گُل سوئی ہوئی تھی۔ اس کی بھاری بھرکم برقع پوش ماں نے اسے گود میں اٹھالیا مگر کچھ ہی دور چلنے کے بعد وہ ہانپنے لگی۔ پری گُل اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی۔ اس کی ماں اسے گود میں اٹھائے چپ چاپ آگے بڑھتی گئی مگر پھر جب پاس سے کچھ فوجی گاڑیاں گزریں اور لوگوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں تو لڑکی جاگ اٹھی اور رونے لگی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے اماں اور ابا اتنے سارے لوگوں کے ساتھ گھر سے باہر نکل کے کہاں جارہے ہیں۔ شور بڑھ گیا تھا۔ پری گُل نے چلّا چلّا کے رونا شروع کردیا اور ماں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کا بابا شیر ولی جو ایک ٹھیلے پر بستر، کچھ برتن اور کپڑوں کی پوٹلیاں لادے آگے آگے چل رہا تھا، ٹھہر گیا۔ اس نے بیوی کی خراب حالت دیکھی تو کہا کہ وہ پری گُل کو ٹھیلے کے اوپر رکھی کپڑے کی پوٹلیوں کے ساتھ بٹھادے۔ ماں نے زبردستی روتی لڑکی کو شیر ولی کے ٹھیلے پر چڑھا دیا اور خود برقعے میں ڈوب کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

پری گُل ٹھیلے پر بیٹھنے کے بعد بھی مسلسل روئے جارہی تھی۔ قافلہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں بابا؟'' پری گُل نے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے لال ہو رہی تھیں اور ناک سے پانی بہہ کے اس کے سرخ ریشم سے کڑھے ہوئے پیلے کرتے میں جذب ہو رہا تھا۔

بابا پہلے خاموش رہا مگر جب پری گُل کا واویلا بند نہیں ہوا تو اس نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے چپ ہو جانے کو کہا۔ ''تجھے بھوک تو نہیں لگی؟'' اس نے پوچھا۔ ''بسکٹ کھائے گی؟'' شیر ولی نے ٹھیلے پر رکھے ایک تھیلے میں سے بسکٹوں کا ایک لال ڈبا باہر نکالا مگر جواب میں پری گل نے اتنے زور کی چیخ ماری کہ پہاڑی درختوں پر بیٹھے سب پرندے اڑ گئے۔

وہ سب منہ اندھیرے گھر سے نکلے تھے، سروں پر اپنا سامان اٹھائے، مگر اب دور برف سے ڈھکی پہاڑی فصیلوں پر دھوپ کی یلغار شروع ہو چکی تھی۔

شیر ولی نے پری گل کے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا اور بولا، ''تو روتی کیوں ہے پگلی۔ اماں اور بابا دونوں تیرے پاس ہی تو ہیں۔''

''میں گھر جاؤں گی بابا۔'' پری گُل نے پہلی بار بابا کو اپنے رونے کی اصل وجہ بتائی۔

''گھر—'' شیر ولی نے افسردگی سے کہا، ''ہاں ہاں ضرور گھر جائیں گے مگر ابھی نہیں۔ پری گُل تجھے پتا نہیں وہاں بہت خطرہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے شیر ولی کو جھرجھری آ گئی۔

ایک آدمی اپنی سائیکل پر صندوق لادے ان کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے جاتے جاتے شیر ولی سے کہا، ''ہمیں دوپہر سے پہلے دریا پار کر کے سرکاری علاقے میں پہنچنا ہے ورنہ پتا نہیں کیا ہو۔ انھوں نے کل شام ساتھ والے گاؤں میں کئی گھر دھماکے سے اڑا دیے ہیں۔''

شیر ولی کو سب پتا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم تھا کہ کل جس آدمی کو گاؤں سے باہر ایک درخت سے لٹکا کے سرِعام پھانسی دی گئی تھی وہ قریبی تھانے میں محرر تھا۔

پھر علاقے کے سارے لوگ، مرد، عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں سے نکلے اور آگے روانہ ہوئے جیسے اچانک تباہ کن سیلاب آ جانے پر بستی والے بچاؤ کے لیے کسی اونچے اور محفوظ مقام کی تلاش میں جاتے ہیں۔ ابھی تھوڑا سا ہی راستہ طے ہوا تھا کہ پری گُل

نے شور مچا دیا۔ قافلے کے کچھ بزرگوں اور کچھ بڑی بوڑھیوں نے آگے بڑھ کے پری گُل کو سمجھانا چاہا مگر بے سود، بچی ضد کر رہی تھی، رو رہی تھی، ہاتھ پاؤں اچھال رہی تھی، مجھے گھر جانا ہے، گھر جانا ہے۔ گھر کیوں جانا ہے؟ شیر ولی نے تلخی سے سوچا۔ یہ سب لوگ گھر کیوں جاتے ہیں؟ کہیں قبرستان میں بھی گھر ہوتے ہیں؟

اسے یاد آیا، ساتھ والے ایک محلے کے پانچ گھروں پر اچانک گولے آ کے گرے اور وہاں کچھ نہیں بچا۔ پھر بھی کتنے لوگ وہاں رہنے کو تیار تھے۔ کتنا مشکل ہوتا ہے گھر کو چھوڑنا۔ ایک دن عمر خان کی دُکان سے مسلح افراد عورتوں کے سارے سلے ہوئے کپڑے اٹھا کے لے گئے تو اس نے اپنی ٹیلرنگ شاپ بند کردی اور سڑک پر عورتوں اور مردوں کے ازار بند بیچنے لگا۔ اسی طرح ایک پک اپ کا ڈرائیور داڑھی منڈوا کے حجام کی دُکان سے نکلا ہی تھا کہ اسے پکڑ کے سب کے سامنے گنجا کردیا گیا اور پھر حجام کو بھی داڑھی مونڈنے کا جرم کرنے پر پک اپ ڈرائیور سے اپنا سر منڈوانا پڑا۔ شیر ولی نے پلٹ کے دیکھا۔ قافلہ بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

ایک آدمی سر پر پلنگ اٹھائے چلا جا رہا تھا جس پر اس کی معذور ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ شیر ولی کے ٹھیلے کے پاس آ کے بولا، ''اڑی ہوئی ہے کہ دریائی پل بھی خطرے میں ہے اور اس کے پہرے داروں کی چوکی پر صبح سے دو بار فائرنگ ہوئی ہے۔''

پری گُل نے پھر اپنی ٹانگ اچھالی اور نعرہ لگایا: ''مجھے تو گھر جانا ہے!''

''نہ نہ بٹی۔'' ایک بوڑھے ٹھیلے والے نے جو بھٹے لیے جا رہا تھا، کہا اور ایک بھنا ہوا بھٹا پری گُل کی طرف بڑھایا۔ ''لے بھٹا کھا۔''

''میں نے نہیں لینا۔'' پری گل نے غصے سے جواب دیا، ''میں نے گھر...''

''بس چپ کر جا۔'' پری گل کی ماں برقعے کے اندر گرجی، ''کچھ پتا بھی ہے کیا مصیبت آئی ہوئی ہے۔'' چیڑ کے درختوں سے گھری ہوئی پہاڑیوں کے درمیان راستہ طے کرتے ہوئے قافلے والوں کو دور سے نیچے وادی میں نیلا پرشور دریا بہتا ہوا نظر آ رہا تھا جس پر لگے ہوئے لکڑی کے پل کو پیدل پار کرنا تھا۔ اسی وقت دور کہیں ایک توپ گرجی اور اوپر

پہاڑوں میں ایسا سیاہ دھواں پھیلنے لگا کہ دھوپ بھی کالی ہوگئی۔ قافلے والے ذرا دیر کو ٹھٹک کے درختوں کی آڑ لینے لگے مگر پھر جب کچھ دیر تک کوئی اور آواز سنائی نہ دی تو ان کا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ عورتیں چلتے چلتے زیرِلب دعاؤں کا ورد کررہی تھیں۔

پری گل نے اپنے بابا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے زور سے اپنا سر ٹھیلے پر رکھے ہوئے جست کے ٹرنک پر مارا اور پھر سے رونے لگی۔ شیر ولی کو پری گل پر پہلے پیار اور پھر بڑا ترس آیا۔ وہ اس کی چہیتی بیٹی تھی۔ اس نے آج تک اس کی کوئی فرمائش اور کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔ ایک بار جب وہ بہت چھوٹی تھی اور اسے ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا، شیر ولی گھنٹوں اس کے پلنگ کے پاس بیٹھا اس کے اچھے ہونے کی دعائیں مانگتا رہتا اور پھر میلوں پیدل چل کے دور کے ایک گاؤں میں موجود حکیم جی سے اس کے لیے دوا لاتا۔ پھر جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اسے بابا کے کندھوں پر سوار ہوکے پیڑوں سے آلوچے اور خوبانیاں توڑنا اچھا لگتا تھا۔ پری گل کو گلہریاں، خرگوش، بھیڑ کے بچے اور طوطے بہت پسند تھے۔ پھر ایک دن شیر ولی کو ایک سفید رنگ کا بلی کا بچہ پیڑوں کے ایک جھنڈ میں زخمی حالت میں ملا۔ اسے کسی کتے نے بھنبھوڑ کے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسے گھر لے آیا۔ بلی کا بچہ مرہم پٹی سے ہفتے بھر میں ٹھیک ہوگیا اور پری گُل کے آگے پیچھے گھومنے لگا۔ پری گل نے اس کا نام موتی رکھا تھا۔ موتی ہر وقت پری گل کے ساتھ رہتا لیکن جب وہ اسکول جاتی تو موتی ماسٹر جی کی بید کی چھڑی سے ڈر کے گھر بھاگ آتا۔ ماسٹر جی جس اسکول میں پڑھاتے تھے اس میں صرف دو کمرے تھے جن میں بڑے بچے سب پڑھتے تھے، لہٰذا ماسٹر جی چھوٹے بچوں کو آڑو کے پیڑ کے نیچے سبق پڑھاتے۔ پری گل کو اپنا سبق فرفر یاد ہوجاتا تھا۔ اسے اپنی کتاب بہت اچھی لگتی تھی، رنگین تصویروں والی۔ تے سے تختی، عین سے عینک، بے سے بکری، بے سے بابا بھی اور میم سے موتی۔ اور میم سے موٹی بھی۔ وہ ہنستی۔ اماں تو موٹی ہے۔ اور اماں اس سے بالکل ناراض نہیں ہوتی تھی۔ پری گل کو اپنی اماں بھی بہت اچھی لگتی تھی۔ بالکل بے سے بکری!

پھر ایک دن اسکول نہیں کھلا۔ آلوچے کے پیڑ کے نیچے ہری ہری گھاس پر گلہریاں بچوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھریں مگر کوئی بچہ اسکول نہیں آیا۔ ماسٹر جی کو

اچانک مردہ پایا گیا تھا۔ ان کے سر کے پیچھے گولی لگی تھی۔ اسکول بند ہونے کے بعد سے پری گل کو گلہریاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اسے آلوچے کھٹے لگنے لگے اور خوبانیوں سے بو آنے لگی۔ پری گل اتنی اداس رہنے لگی کہ شیر ولی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے خوش کرنے کے لیے کیا کرے۔ موتی نہ ہوتا تو پری گل کا پتا نہیں کیا حشر ہوتا۔

عید سے ذرا پہلے شیر ولی کو ایک دُکان پر لال رنگ کا نہایت خوب صورت ڈبّا نظر آیا جس میں سیپیوں کا ایک چمک دار ہار تھا۔ ہار مہنگا بھی نہیں تھا لہٰذا شیر ولی نے اسے پری گل کے لیے خرید لیا۔ وہ ہار دیکھ کے بہت دنوں بعد کھلکھلا کے ہنسی۔ پری گل خاص خاص موقعوں پر وہ ہار پہنتی اور اترا اترا کے ہر ایک کو دکھاتی۔ پھر اس نے ہار کا ڈبّا کہیں احتیاط سے رکھ دیا تھا۔ اور اب اچانک شیر ولی پر یہ انکشاف ہوا کہ گھر چھوڑتے وقت لال ڈبے کو کسی نے صندوق میں نہیں رکھا تھا۔ اچھا، اب اسے پتا چلا کہ پری گُل بار بار کیوں گھر لوٹنے کے لیے فریاد کررہی تھی۔ اس کا موتی بھی تو وہیں چھوٹ گیا تھا جس کو آنے سے پہلے کہیں بند کردیا گیا تھا۔ شیر ولی نے ٹھیلے پر رکھی کپڑے کی پوٹلیوں پر پچھاڑیں کھاتی پری گل کو افسوس سے دیکھا اور پھر پیار سے اس کا سر سہلانے لگا۔

''نہ رو بیٹی، نہ رو۔'' وہ اس کے بالوں کو چوم کے بولا، ''میں لے آؤں گا تیرے موتی کو۔''

''میں گھر جاؤں گی بابا۔'' پری گل نے فریاد کی۔

''ابھی ٹائم نہیں ہے۔'' شیر ولی نے اسے سمجھایا، ''میں پھر جاؤں گا گاؤں اور تیری چیزیں لے آؤں گا۔'' مگر پری گل پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ اسی طرح روتی دھوتی رہی۔

اچانک ایک سوزوکی پک اپ قریب آکے رکی، اس پر دو آدمی سوار تھے۔ انھوں پوچھا، ''کیا بات ہے بچی کیوں رو رہی ہے، کوئی تکلیف ہے کیا؟''

''اصل میں...'' شیر ولی نے بتایا، ''جلدی میں کچھ سامان اس کا گھر پر چھوٹ گیا ہے اس لیے۔''

آدمی نے کہا، ''کوئی بات نہیں۔ اتفاق سے ہم گاؤں کے قریب فوجی چوکی تک جارہے ہیں۔ کام ختم ہوتے ہی واپس آئیں گے، اگر تم ساتھ چلنا چاہو تو چلو، سامان لے آؤ۔ ابھی گاؤں سے زیادہ دور تو آئے نہیں۔'' شیر ولی نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو ٹھیلے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے برقعے کے اندر ہی سر ہلا دیا کہ تجویز بری نہیں کہ اس طرح پری گل کا رونا دھونا تو بند ہوگا۔

پک اپ والے نے کہا، ''ایسا کرو بچی کو بھی ساتھ بٹھالو، زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹا لگے گا واپسی میں۔''

شیر ولی نے پری گل کو اٹھایا اور پک اپ کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔

''فکر مت کرنا۔ بس ابھی گیا اور آیا۔ تم ٹھیلے کے ساتھ قافلے میں چلتی رہنا۔''

پک اپ تیزی سے گاؤں کی طرف روانہ ہوگئی۔ گاؤں میں مکمل سناٹا تھا۔ جب گاڑی آڑو کے ایک پیڑ کے گرد گھوم کے اس گلی میں مڑی جس میں شیر ولی کا گھر تھا تو ایک مرغا تیزی سے پر پھڑپھڑاتا سنسان راستے پر دوڑ گیا۔ پک اپ رکتے ہی شیر ولی نے پری گل کو نیچے اتارا اور گھر کا تالا کھولا۔ اندر آنگن میں سامنے ہی چارپائی بچھی ہوئی تھی جس کے ایک پائے پر ایک کوا بیٹھا تھا، وہ ان کے اندر آتے ہیں ہڑبڑا کے اڑ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر کوئی نہ تھا۔

''اب بتا تیرا موتی ہے کہاں؟'' شیر ولی نے پری گل سے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا؟'' پری گل نے جواب دیا، ''کہیں بھاگ گیا ہوگا۔''

''تو پھر تُو کیا لینے آئی ہے یہاں؟'' شیر ولی نے چڑ کے کہا، ''اتنا رونا دھونا مچایا تو نے اس کے لیے، میں گھر جاؤں گی، میں گھر جاؤں گی۔ گھر کی بچی۔''

''میں موتی کے لیے تو یہاں نہیں آئی۔'' پری گل بولی۔

''کیا؟'' شیر ولی نے حیرت سے پوچھا، ''پھر؟''

''میں تو اپنا لال ڈبا ڈھونڈنے آئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''لال ڈبا— کہاں ہے لال ڈبا؟'' شیر ولی نے سوال کیا، ''مجھے پتا ہے لال

ڈبے میں تیرا چہیتا ہار جو رکھا ہے۔ چل اس کو نکال لا شاباش۔'' وہ پیار سے بولا۔

پری گل پھرتی سے کمرے میں گئی۔ وہاں کونے میں پانی کے مٹکے کے پیچھے ایک کنستر رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے کنستر کھولا اور ہاتھ ڈال کے اندر سے اپنا چھپا ہوا خزانہ باہر نکال لیا۔ لال ڈبا!

''اب تو جلدی سے ڈبے میں سے اپنا ہار نکال کے گلے میں پہن لے، ڈبے کو لے جا کے کیا کریں گے۔ ٹھیک ہے۔'' شیر ولی نے کہا۔

''ہار۔'' پری گل ہنسی۔ ''ہار تو اس میں نہیں ہے بابا۔''

''کیا؟'' شیر ولی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

پری گل نے لال ڈبا کھولا۔ اندر چمکتے ریشمی خانے میں کتاب رکھی تھی۔ اس کے اسکول کی کتاب۔ رنگین تصویر والی۔ شیر ولی حیرت زدہ رہ گیا۔ ''اور ہار؟''

''مجھے کیا پتا۔'' وہ بولی۔

اسی وقت شیر ولی کو چھوٹی کوٹھڑی کے دروازے کے پیچھے سے کچھ آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی اسے کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے زور سے دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا اور موتی باہر نکل آیا۔ بھوک سے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں مگر اس کے گلے میں سیپیوں کا ہار چمک رہا تھا۔

رشتے ناتے

یہ لوگ وہ تھے جو سخت زخمی حالت میں اسپتال لائے گئے تھے اور سب کے سب غشی کے عالم میں تھے اور ایک کے ہوش میں آنے کی امید بھی نہیں تھی، کیوں کہ وہ چل بسا تھا۔

نیلی قمیص، سفید شلوار اور خاکی کوٹ میں ملبوس شخص۔ ایک بوڑھا، آلہ سماعت سمیت۔

ترکی ٹوپی والا، اور وہ جس کی داہنی ٹانگ سلامت نہ رہی تھی۔

سرمئی کرتے شلوار اور ربڑ کے تلوں والی پشاوری سینڈل والا جس کے بدن میں گولیاں پیوست تھیں۔

اور بڑے گھر میں صبح سے کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ بڑے میاں غائب ہوگئے تھے۔ وہ صبح کو حسبِ معمول چھڑی ہاتھ میں لے کر ٹہلنے نکلے تھے، پھر واپس نہ لوٹے۔ وہ روزانہ سویرے اٹھتے اور صبح کی نماز سے فارغ ہو کے چہل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ قریب میں کوئی دریا نہیں تھا، نہر نہیں تھی، کوئی باغ نہیں تھا، بس سامنے ریل کا ایک پل تھا اور پل کے پار بے شمار، سڑکیں، چوڑی چوڑی چمک دار سڑکیں جن کے بیچوں بیچ سبزے کی پٹی دور تک چلی گئی تھی۔ سڑکوں پر بے حد ہجوم ہوتا اور ہر دم موٹروں کا ایک گھنا جنگل متحرک رہتا۔ بڑے میاں کی عادت تھی کہ وہ گھر سے نکل کے ٹہلتے ہوئے سڑک کے کنارے کنارے دور تک چلے جاتے اور کبھی کبھی پل پر کھڑے ہو کے شہر پر اترتی دھند کا لطف

اٹھاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ راستے میں ان کا ٹکراؤ چچا جھگی سے ہو جاتا جو سب گھر والوں کے دوست تھے، وہ انھیں گھسیٹ کے اپنے گھر لے جاتے جہاں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور ناشتے کے بعد کچھ دیر کے لیے شطرنج کی بازی جمتی اور پھر مزید ایک ایک کپ چائے کے بعد محفل برخاست ہوتی۔ جب وہ آج دیر تک گھر نہ پہنچے تو پہلے یہی خیال کیا گیا کہ وہ یقیناً چچا جھگی کے گھر بیٹھے شطرنج کھیلتے ہوں گے — جائیں گے کہاں؟ لیکن پھر کوئی ہرکارہ خبر لایا کہ چچا جھگی تو خود صبح سے مچھلی کے شکار پر گئے ہوئے ہیں، ان کے یہاں تو آج بڑے میاں کے قدم پہنچے ہی نہیں۔ اور اب گھر بھر میں کھلبلی مچی تھی اور بالائی منزل کے بڑے کمرے میں گھر کے سب بڑے جمع تھے۔ گھر کی سب سے بزرگ خاتون یعنی بڑے میاں کی اہلیہ، ان کی بیٹیاں اور بہوویں اور بہوؤں کے بچے۔ بڑے میاں کے بڑے صاحب زادے جو ایک بینک کے سربراہ تھے، اس وقت اپنے دفتر میں تھے اور چھوٹے صاحب زادے جو پائے کے بیرسٹر تھے، کچہری گئے ہوئے تھے۔

بڑے میاں کی صرف ایک بیٹی تھی اور شادی شدہ، اتفاق سے وہ ان دنوں اپنے میکے میں آئی ہوئی تھی۔ اس کا شوہر شہر کا ایک مشہور تاجر تھا۔

جب بڑے میاں کا دوپہر تک کوئی پتا نہیں چلا تو بڑے میاں کی اہلیہ نے بہوؤں کے مشورے سے اپنے بینکر بیٹے کو فون کیا جو اس وقت عالمی بینکرز کے ایک مذاکرے میں شرکت کر رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر فون تک آیا۔

اماں نے کہا، ''بیٹا تمھارے ابا نہیں لوٹے اب تک!''

بیٹا بولا، ''آجائیں گے، وہ بھلا کون سی بینکرز کی میٹنگیں اٹینڈ کر رہے ہوں گے۔''

اماں نے کہا، ''میرا مطلب ہے، وہ غائب ہو گئے ہیں۔''

''کیا؟'' بیٹے نے کہا، ''وہ بھلا اس عمر میں کیسے غائب ہو سکتے ہیں؟''

اماں بولیں، ''نہیں بیٹا مجھے تو بڑا ہول آ رہا ہے، اتنی دیر تو انھیں کبھی نہیں ہوئی، ضرور کچھ ہوا ہے، تم گھر آجاؤ فوراً۔''

''ارے!'' بینکر صاحب نے مضطرب ہو کے کہا، ''میں گھر آجاؤں، اماں آپ

بھی کمال کرتی ہیں۔ باہر سے اتنے سارے بینکرز آئے ہوئے ہیں، ان کی میٹنگ ہے، میں بہت زیادہ مصروف ہوں، آپ چھوٹے بھیا کو کیوں نہیں بلا لیتیں۔''

اماں نے کہا، ''اسے بھی بلا لوں گی مگر اس کا مقدمہ ہے، میری مانو تم کچھ دیر کے لیے گھر آجاؤ۔''

بینکر صاحب نے ایک لمحے کو سوچا، پھر کہا، ''اچھا میں ابھی آتا ہوں، آپ چھوٹے بھیا کو بھی فون کر دیں۔'' پھر انھوں نے کانفرنس روم میں شرکا اجلاس سے غیر حاضر رہنے کی اجازت طلب کی اور گھر کی طرف لپکے۔ ان کی سیکریٹری بھی ساتھ تھیں کیوں کہ سیکریٹری کے بغیر ان کے سارے دماغی کام ادھورے رہتے۔

جب وہ گھر پہنچے تو دیکھا چھوٹے بھائی کی گاڑی بھی پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو بڑی بیگم نے اپنی بیٹی سے کہا، ''اب تم اپنے دولھا کو بھی فون کر کے بلا لو۔''

بیٹی ''اچھا'' کہہ کے نخرے سے اٹھیں اور ٹیلی فون اٹھا کے میاں کے دفتر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی آواز آئی، ''ہیلو کون؟''

''میں بول رہی ہوں، آپ ذرا گھر آجائیے۔''

''کیوں خیریت ہے؟'' حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

''ابا صبح کے وقت سیر کے لیے نکلے تھے، اب تک واپس نہیں آئے۔''

ہنس کے فرمایا، ''بہت شریر ہو گئے ہیں۔''

بولیں، ''نہیں وہ کھو گئے ہیں۔''

کہا، ''بھلا وہ کہاں کھو سکتے ہیں؟''

''آپ آ رہے ہیں یا نہیں۔'' وہ خفا ہو گئیں۔

''اچھا بھئی ناراض مت ہو، میں ابھی آتا ہوں مگر کسی نے پولیس میں بھی اطلاع کی یا نہیں؟''

انھوں نے کہا، ''بس آپ آجائیے۔'' اور ٹیلی فون رکھ دیا۔

سب کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ بڑی بیگم نے پوچھا، ''کیا کہہ رہے تھے تمھارے دولھا؟''

کہا، ''کہتے تھے پولیس کو اطلاع دی یا نہیں؟''

بیرسٹر صاحب نے چونک کے کہا، ''ہاں علاقے کے پولیس اسٹیشن پر رپورٹ تو ضرور ہونی چاہیے۔''

بینکر صاحب ملازمین سے پوچھ گچھ میں مصروف تھے۔ بیرسٹر صاحب نے فون اٹھایا اور علاقے کے تھانے کا نمبر ملایا۔ انچارج بیرسٹر صاحب سے خوب واقف تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے بولا، ''تسی حکم کرو جی، کوئی ضمانت کا کیس ہے گا یا...''

''نہیں بھئی!'' بیرسٹر صاحب بولے، ''کچھ ذاتی معاملہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب صبح چہل قدمی کے لیے گئے تھے لیکن اب تک واپس نہیں لوٹے، کہیں آتے جاتے بھی نہیں، اس لیے سب پریشان ہیں، میرا خیال ہے کہ ان کی گم شدگی کی رپورٹ لکھ لیں آپ۔''

''ہاں ہاں...'' تھانے دار نے کہا، ''ذرا حلیہ بھی بتا دیں۔ ابھی سارے تھانوں کو اطلاع کردیتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی پتا چل جائے گا۔''

بیرسٹر صاحب فون سے فارغ ہوئے تو بینکر صاحب نے اپنی سیکریٹری سے کہا، ''ذرا دفتر سے پتا کرو سمپوزیم کس منزل میں ہے اور کتنے لوگ تقریر کر چکے؟''

سیکریٹری نے فوراً موبائل پر دفتر کا نمبر ملایا اور تھوڑی دیر تک سر ہلا ہلا کے بینکر صاحب کے نائب سے باتیں کرتی رہی۔ بات ختم کرکے اس نے بینکر صاحب سے کہا، ''ابھی صرف تین تقریریں ہوئی ہیں سر... آپ کا نمبر تو سب سے بعد میں ہے۔'' بینکر صاحب نے کہا، ''مگر میں کیسے جاسکتا ہوں۔ خیر دیکھا جائے گا۔''

اسی وقت ان کے تاجر بہنوئی صاحب تشریف لے آئے۔ انھوں نے آتے ہی پہلے طائرانہ نظر سے کمرے کا جائزہ لیا، شرکائے محفل کو گنا اور اپنی بیگم کو شریکِ جلسہ نہ پا کے کچھ رنجیدہ ہوئے کیوں کہ سب سے پہلے انھیں اپنی نصف بہتر کی نظر میں سرخرو ہونے کا ارمان تھا۔ انھوں نے بڑی بیگم کی صدارت میں ہونے والے اس ہنگامی اجلاس میں اپنی

موجودگی کا اعلان اس جملے سے کیا کہ ''مجھے بے حد افسوس ہے،'' پھر انھوں نے پلٹ کے بینکر صاحب سے پوچھا، ''کیا پولیس کو اطلاع دے دی گئی ہے؟''

''ہاں۔'' بینکر صاحب بولے۔

بیرسٹر صاحب نے کہا، ''کیوں نہ ریڈیو اور ٹی وی پر گم شدگی کا اعلان بھی کردیا جائے؟''

''بہت مناسب خیال ہے۔'' تاجر صاحب بولے، ''میری رائے میں شام کے سب اخبارات میں بھی اشتہار دے دیا جائے تو بہتر رہے گا۔''

بینکر صاحب نے فوراً یہ دونوں کام اپنی سیکریٹری کے سپرد کردیے۔

سیکریٹری نے موبائل سنبھالا اور بولی، ''مضمون کیا ہوگا؟''

''ہاں مضمون۔'' بینکر صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے تاجر صاحب اور تاجر صاحب نے بیرسٹر صاحب کو دیکھا۔ بیرسٹر صاحب نے بڑی بیگم کی طرف چہرہ گھمایا۔

انھوں نے لال افسردہ آنکھوں کو جھکایا اور منہ ہی منہ میں کوئی وظیفہ دہرانے لگیں۔ ان کے گورے چٹے چہرے پر افسردگی کی پرچھائیں مزید گہری ہوگئی۔

بینکر نے کہا، ''میرا خیال ہے کہ مضمون اس طرح شروع ہونا چاہیے کہ ہمارے والد...''

بیرسٹر صاحب نے بیچ میں ٹوکا، ''نہیں ہمارے والد نہیں، نام ہونا چاہیے۔ اچھا... نام سہی... خان بہادر جناب...''

''نہیں۔'' تاجر صاحب بولے، ''القاب و آداب کے بجائے سیدھا سادا اعلان ہونا چاہیے کہ فلاں صاحب جن کی عمر اتنی اور نام و پتا یہ ہے، فلاں وقت سے لاپتا ہیں جن صاحب کو ان کے بارے میں کچھ علم ہو، بلاتکلف اس ٹیلی فون نمبر پر اطلاع دیں۔''

''بلاتکلف کی کیا ضرورت ہے؟'' بیرسٹر صاحب بولے، ''اس کے بجائے فوراً ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' تاجر صاحب نے کہا، ''اسے حذف کردیجیے۔''

سیکریٹری نے نوٹس لیے اور اپنے موبائل پر مسلط ہوگئی۔

تاجر صاحب پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اس وقت ان کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا اور ان کی مسرت کسی ایسے لیڈر کی مسرت سے مشابہ تھی جس کی قرارداد بھرے جلسے

میں اتفاقِ رائے سے منظور کرلی جائے۔ انھوں نے ایک بار پھر مضطرب نگاہوں سے اپنی بیگم کو تلاش کیا مگر وہ اب تک ان کے کارناموں سے بے خبر تھیں۔ انھوں نے ملازم سے جو سب کے لیے چائے لے کر آیا تھا، آہستہ سے پوچھا، ''چھوٹی بیگم کہاں ہیں؟''

''جی وہ تو بیڈ روم میں ہیں، بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا، اسے سلا رہی ہیں!'' وہ بولا۔

''کیا؟'' تاجر صاحب پریشان ہوئے، ''گڈو کو کیا ہوا؟'' وہ لوگوں کو سوچ میں غرق پا کے اپنی جگہ سے اٹھے اور لپک کے بیڈ روم میں پہنچے جہاں ان کی بیگم ان کے لختِ جگر کو سلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ انھوں نے آہستہ سے بیگم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ بیگم نے بچے کو تھپکتے ہوئے چہرہ گھما کے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، ''اچھا آپ آگئے۔''

''بہت دیر ہوئی عالی جناب، مگر یہ گڈو کو کیا ہوا ہے؟''

بیگم نے کہا، ''صبح سے ابا کو یاد کر کے رو رہا ہے... بہت ہلا ہوا ہے نا ان سے۔''

''کچھ پتا چلا... مجھے تو امی کی بڑی فکر ہے، وہ بہت پریشان ہیں۔''

اور یہ صحیح بھی تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں اداسی کی دھند اتنی گہری تھی کہ ان کی عینک کے شیشے دودھیا سے لگ رہے تھے۔ بڑے میاں گھر میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے اور گھر کے ہر فرد سے ان کا جذباتی تعلق تھا۔ گھر کے نوکروں میں بھی ان کی بڑی عزت اور اہمیت تھی اور ان کی ہر مشکل میں وہی کام آتے۔

جب تاجر صاحب بچے کو سلانے کی مہم میں اپنی بیگم کا ہاتھ بٹا کے بڑے کمرے میں واپس پہنچے تو محفل پر سنجیدگی کا رنگ اور گہرا ہو چکا تھا۔ بینکر صاحب نے سیکریٹری کو اشارہ کیا تو اس نے ایک بار پھر موبائل فون پر دفتر کا نمبر ملایا اور بینکروں کی کانفرنس کی پروگریس کے بارے میں پتا کیا۔ پھر اس نے کہا۔

''آدھی سے زیادہ تقریریں ہو چکی ہیں سر!''

بینکر صاحب نے کندھے اُچکائے جیسے کہہ رہے ہوں، میں کیا کرسکتا ہوں۔

اتنے میں کسی نے ہاتھ بڑھا کے ٹی وی چلا دیا۔ ٹی وی پر بڑے میاں کی گم شدگی کا اعلان تھوڑے تھوڑے وقفے سے نشر ہو رہا تھا۔

ادھر باورچی خانے میں خانساماں اور بینکر صاحب کے ڈرائیور میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ بڑے صاحب آخر کہاں جاسکتے ہیں۔ ڈرائیور کا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر کہیں چھپ گئے ہیں تاکہ سب کو اپنی اہمیت کا احساس دلایا جاسکے مگر خانساماں کو اس نظریے سے شدید اختلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ضرور کسی موٹر وٹر کے نیچے آگئے ہیں، آج کل سڑک پر موٹروں کا کتنا رش ہوتا ہے، ''اللہ خیر کرے...کوئی حادثہ نہ...!''

یہ گفتگو اچانک بڑی بہو بیگم کے کان میں پڑی جو اتفاقاً ادھر سے گزر رہی تھیں۔ انھوں نے کمال صفائی سے حادثے کا لفظ اُچک لیا، پھر ہانپتی کانپتی بڑے کمرے میں پہنچیں اور جیسے انکشاف کرتے ہوئے بولیں، ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انھیں کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔''

بڑی بیگم صاحبہ کا رنگ زرد ہوگیا، ''اللہ نہ کرے!'' انھوں نے بے چارگی سے بیٹوں کی طرف دیکھا۔

تاجر صاحب نے کہا، ''امید ہے ایسا نہیں ہوا ہوگا مگر پتا کرنے میں کوئی حرج نہیں!''

بینکر صاحب نے کہا، ''کیوں نہ ہم لوگ چلیں اور...''

بیرسٹر صاحب بولے، ''بہتر یہ ہے کہ پہلے مختلف اسپتالوں کو فون کرکے پتا کیا جائے کہ وہاں کس قسم کے کیس آئے ہیں۔''

تجویز معقول تھی اور ایک بار پھر سیکریٹری کو یہ کام سپرد کیا گیا۔ سیکریٹری نے ایک بڑے اسپتال کا نمبر ملایا۔ سب ہمہ تن گوش تھے۔

سیکریٹری نے پوچھا، ''آپ بتا سکتے ہیں صبح سے آپ کے یہاں حادثات کے کتنے کیس آئے ہیں؟''

ادھر سے جواب آیا، ''ایک کیس ہے بس... ایکسیڈنٹ میں ایک شخص چل بسا... اس کا سر پھٹ گیا تھا۔''

''اس کا حلیہ؟'' سیکریٹری نے سوال کیا۔

متوفی نیلی قمیص، سفید شلوار اور خاکی کوٹ پہنے ہوئے تھا، ایک ہاتھ میں

انگوٹھی بھی تھی۔

سیکریٹری نے کہا، ''ذرا ٹھہریے۔'' پھر بینکر سے پوچھا، ''وہ کیا پہنے ہوئے تھے؟'' کمرے میں بیٹھے ہوئے سب افراد نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر کسی کے پاس اس سوال کا جواب موجود نہ تھا۔ کسی نے بڑے میاں کو تیار ہو کے باہر جاتے نہ دیکھا تھا۔ وہ سب طرح کے کپڑے پہنتے تھے۔

بیرسٹر صاحب نے کہا، ''ذرا عمر پوچھو۔''

سیکریٹری نے پوچھا، ''اس شخص کی عمر کیا ہوگی؟''

جواب آیا، ''جوان نہیں ہے، سر پر بال بھی بہت کم ہیں۔''

بڑی بیگم صاحبہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یہ حلیہ کسی حد تک بڑے میاں سے ملتا جلتا تھا مگر بالوں کے سلسلے میں اتفاقِ رائے نہ ہوسکا۔

سیکریٹری نے دوسرے اسپتال کا نمبر ملایا، ''کیا آپ کے یہاں کوئی بوڑھا شخص حادثے میں زخمی ہو کے آیا ہے۔''

''جی ہاں، صبح ایک آدمی سخت زخمی حالت میں لایا گیا ہے، بوڑھا آدمی ہے۔''

''اس نے اپنا نام کیا بتایا؟''

''معاف کیجیے، وہ اپنا نام نہیں بتا سکتا، کیوں کہ اسے اب تک ہوش نہیں آیا۔''

''کیا وہ شیروانی پہنے ہوئے ہے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے شیروانی تو نہیں پہن رکھی۔

''پھر وہ کیا پہنے ہوئے ہے۔''

''کوٹ پتلون۔''

''ہاں ٹھیک ہے!'' بڑے میاں کی بیٹی بولیں، ''عام طور پر ابا کوٹ پتلون ہی پہنتے ہیں گھر سے نکلتے وقت۔''

سیکریٹری نے پوچھا، ''اور کوئی پہچان؟''

جواب آیا، ''اس شخص کے پاس سے آلۂ سماعت بھی برآمد ہوا ہے۔''

''ہاں... ابا تو آلۂ سماعت بھی لگاتے ہیں۔''

''واہ!'' بیرسٹر صاحب نے کہا، ''مگر ان کا آلہ تو کچھ دن پہلے ٹوٹ گیا تھا، وہ اب تک کہاں بنا؟''

بیٹی نے کہا، ''پوچھیے، کیا ان کے ہاتھ میں چھڑی بھی تھی؟''

سیکریٹری نے پوچھا، ''کیا چھڑی تھی ان کے ہاتھ میں؟''

جواب آیا، ''ان کے ہاتھ میں چھڑی کہاں سے آتی وہ تو خود دوسروں کے ہاتھوں میں آئے ہیں۔''

سیکریٹری نے ایک اور جگہ فون کیا، ''کیوں جناب! آپ کے یہاں کوئی حادثے کا کیس آیا ہے؟''

''ایک نہیں کئی۔'' کسی نے بہت لہک کے جواب دیا۔

''ان میں کوئی بوڑھا تو نہیں؟''

جواب آیا، ''مگر کتنا بوڑھا، بعض لوگ تو کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔'' دوسری جانب سے بڑی غیرمتوقع زندہ دلی کا مظاہرہ کیا گیا۔

سیکریٹری نے کہا، ''آپ کے یہاں کتنا بوڑھا آدمی آیا ہے؟''

جواب آیا، ''اس کے منہ میں دانت نہیں۔''

سیکریٹری نے پوچھا، ''کیا مطلب؟''

جواب آیا، ''مطلب یہ کہ بندۂ خدا مصنوعی بتیسی سے محروم ہیں۔'' سیکریٹری نے سوالیہ نگاہوں سے پھر افرادِ خانہ کو دیکھا۔ بڑے میاں کی بیٹی نے کہا، ''یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کیوں کہ ہمارے ابا کے تو بڑے خوب صورت مصنوعی دانت ہیں۔''

سیکریٹری نے فون پر پوچھا، ''اور کوئی پہچان؟''

جواب آیا، ''ان کے ساتھ ایک عدد ترکی ٹوپی بھی اسپتال میں داخل ہوئی ہے۔''

بیٹی نے کہا، ''ہاں ترکی ٹوپی تو ابا بھی لگاتے ہیں کبھی کبھی... مگر پتا نہیں آج...''

سیکریٹری نے کہا، ''کوئی اور شخص؟''

جواب آیا، ''ہاں ایک اور آدمی ہے۔ شکل سے کافی معزز بھی۔''

سیکریٹری نے پوچھا، '' کچھ نام پتا؟''

جواب آیا، ''نام پتا تو وہ ہوش میں آنے کے بعد ہی بتا سکیں گے، تب تک انتظار کیجیے یا یہاں خود آنے کی زحمت کیجیے۔ اس لیے کہ اگر یہ وہی شخص ہیں جن کی آپ کو تلاش ہے تو پھر وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی آپ کے پاس نہیں آسکیں گے، کیوں کہ ان کی داہنی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔''

سیکریٹری نے فون بند کیا۔ بڑے میاں کی بیٹی نے کہا،''شاید یہی ہوں ہمارے ابا۔''

ان کے شوہر نے ان کے کندھے کو تھپکا اور بولے،''ان میں سے کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوں گے۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ بینکر صاحب نے فون اٹھایا۔ قریبی تھانے کا ایس ایچ او لائن پر تھا۔ بیرسٹر صاحب نے فون لے لیا۔ تھانے دار نے کہا،''صاحب ابھی پتا چلا ہے کہ پولیس ایک گشتی پارٹی کا کچھ نامعلوم مسلح افراد کے ساتھ ٹکراؤ ہوا ہے جو ایک شخص کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نامعلوم افراد تو مقابلے کے دوران فرار ہوگئے، البتہ اس شخص کو اغوا ہونے سے بچا لیا گیا ہے مگر وہ فائرنگ کے تبادلے میں زخمی ہوئے ہیں، کئی گولیاں انھیں لگی ہیں، انھیں سول اسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔''

بیرسٹر صاحب نے فوراً پوچھا،'' کچھ حلیہ بتا سکتے ہیں آپ؟''

تھانے دار نے کہا،''سرمئی شلوار سوٹ اور ربڑ کے سول والی پشاور چپل...''

بیرسٹر صاحب نے حلیہ دُہرایا۔ بڑے میاں کی بیگم نے کہا،''پتا نہیں، ویسے ہو بھی سکتا ہے وہ یہی کپڑے...''

انھوں نے فون رکھ دیا اور کہا،''اس شخص کو پولیس نے اغوا ہونے سے بچا لیا ہے۔''

''اغوا___ مگر کیوں؟'' بیگم صاحبہ بولیں،''کہیں ایسا تو نہیں کہ انھیں وہ لوگ اغوا کر کے تاوان کی رقم اینٹھنا چاہتے تھے۔ سب کو پتا ہے، انھوں نے بہت دن خلیج میں کاروبار کیا ہے، ان کے سب بچے اچھی پوزیشنوں میں ہیں۔''

بیٹی نے کہا، ''ابا کی سیاسی وابستگی بھی تو تھی ایک پارٹی سے... کیا پتا ان کے مخالفین...''
بینکر صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا، ''اب ہمیں فوراً اسپتال چلنا چاہیے۔''
سب کھڑے ہوگئے۔ عین اسی وقت باہر کے گیٹ کی گھنٹی زور سے بجی۔ بیرسٹر صاحب باہر کی طرف لپکے۔ دروازے پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس میں سے پہلے چچا جگی اترے۔ ان کے ہاتھ میں مچھلیوں سے بھری ہوئی باسکٹ تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے بڑے میاں اترے، جھینپے جھینپے سے۔

چچا جگی نے کہا، ''ہاں میں انھیں ساتھ لے گیا تھا، مچھلیوں کے شکار پر، صبح یہ سیر کے لیے نکلے ہی تھے کہ میرے ہتھے چڑھ گئے۔ میں چاہتا تھا کہ تم لوگوں کو اپنی بے خبری کی تھوڑی سی سزا ملے، کیوں کیسی رہی؟'' وہ زور سے ہنسے۔

بڑے میاں سر جھکائے ہوئے گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو کوٹھی میں شور مچ گیا۔ بچے خوشی سے چیخیں مارتے دوڑے اور نوکروں نے فوراً اندر خبر پہنچائی۔ سب لوگ دریچوں سے جھانک رہے تھے۔

بینکر صاحب نے خوش ہو کے سیکریٹری سے کہا، ''اب ہم لوگ چلیں!'' پھر وہ دروازے کی طرف لپکے جہاں گھر والے بڑے میاں کی پذیرائی کے لیے جمع تھے۔

سیکریٹری صاحبہ نے اپنے کاغذات سمیٹے اور بے کار پرچوں کو دریچے سے نیچے پھینک دیا۔ کاغذ کے ننھے منے ٹکڑے فضا میں خشک پتوں کی طرح ناچتے ہوئے آہستہ آہستہ کوڑے کے ڈرم میں گرنے لگے۔ ان پر بہت سے لوگوں کے کوائف درج تھے:

نیلی قمیص اور خاکی کوٹ والا جو بس کے نیچے آ گیا تھا۔

آلۂ سماعت والا شخص جو سخت زخمی تھا۔

ترکی ٹوپی والا اور وہ بوڑھا جس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔

اور سرمئی شلوار سوٹ والا شخص جس کے بدن میں گولیاں لگی تھیں اور جسے اغوا ہونے سے بچا لیا گیا تھا۔

نجم الحسن رضوی نے نوعمری سے لکھنا شروع کیا۔ افسانوں کے پانچ مجموعے ''چشمِ تماشا'' (۱۹۸۲ء)، ''ہاتھ بیچنے والے'' (۱۹۹۴ء)، ''پرے کا موسم'' (۱۹۹۷ء)، ''انٹرنیٹ کیفے'' (۲۰۰۳ء) اور ''آکسیجن'' (۲۰۰۸ء) شائع ہوئے۔ ''دریا کا گھر'' ان کی کہانیوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ ان کے افسانے ''ہاتھ بیچنے والے'' کو ہندوستان کے ایک انگریزی رسالے نے اپنے ''فیورٹ فکشن نمبر'' میں شائع کیا۔ اس مجموعے کو اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ۱۹۹۴ء میں ہجرہ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

۱۹۹۸ء میں انھیں مجلسِ فروغِ اردو ادب، دوحہ (قطر) کی جانب سے سلیم جعفری انٹرنیشنل ایوارڈ ملا اور ۲۰۱۰ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد کی طرف سے بچوں کے لیے ان کی انگریزی کہانیوں کے مجموعے "Moon Comes to Earth" پر ایوارڈ دیا گیا۔

طنز و مزاح سے خصوصی شغف کی بنا پر نثری پیروڈیوں پر مشتمل ان کی کتاب ''ہمارا بدمعاشی نظام'' ۱۹۹۸ء میں چھپی اور ٹی وی کالموں کا انتخاب ''معذرت کے ساتھ'' کے نام سے اور ادبی مضامین ''حرفِ تازہ'' بالترتیب ۲۰۰۷ء اور ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئے۔

---

۲۳ اپریل ۱۹۴۴ء کو اعظم گڑھ (یوپی) کے موضع دیوگاؤں میں پیدا ہوئے۔ سکھر، حیدرآباد، کراچی، کوئٹہ، راول پنڈی، اسلام آباد اور دبئی میں عمر بتائی۔ جامعہ کراچی سے پہلے صحافت اور پھر اردو ادبیات میں ایم اے کیا۔ ۱۹۸۰ء تک پاکستان میں انگریزی صحافت اور مرکزی وزارتِ اطلاعات سے منسلک رہے۔ اس کے بعد دبئی کے انگریزی روزنامے ''خلیج ٹائمز'' سے لمبی رفاقت نبھائی اور ۲۰۰۸ء کے اواخر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ کراچی واپسی کے بعد جامعہ کراچی کے شعبۂ ابلاغیات میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں، اس کے علاوہ ''خلیج ٹائمز'' میں ایک طنزیہ کالم بھی لکھتے ہیں۔

آنے والی کتابیں

- قصہ در قصہ (افسانوں کا مجموعہ)
- ماروی اور مرجینا (ناول)
- دی پائیڈ پائپرز چلڈرن (بچوں کے لیے انگریزی میں ناول)

دریا کا گھر

نجم الحسن رضوی

ISBN : 978-969-540071-5